امامت
عدل
اور
سماجی انصاف

حجۃ الاسلام والمسلمین محسن قرائتی

بسم الله الرحمن الرحيم

امامت
عدل
اور
سماجی انصاف

حجۃ الاسلام والمسلمین محسن قرائتی

جزاوّل

نام کتاب ________ اِمامت

مترجم ________ قربان علی

جزدوم

نام کتاب: ________ عدل اور سماجی انصاف

مترجم: ________ ڈاکٹر حسین جعفری

مصنف: حجۃ الاسلام والمسلمین محسن قرائتی

سال طبع: ________ ۲۰۰۰ء

نظرثانی: ________ محمد حسین نگر بھکری۔ ایم۔ اے

پیشکش: ________ محمد حسن

تعداد: ________ ایک ہزار

طباعت: ________ مناظر ۶۳۴۰۲۸۹

ناشر: الحسن بک ڈپو مسجد باب العلم بلاک ڈی

نارتھ ناظم آباد، کراچی ۷۴۷۰۰

فون: 6626074

فہرست

جزو اول — امامت

عرض ناشر ۱۶
کیا امامت اصول دین میں ہے ۱۹
امامت اصول دین میں ہے ۲۱
نتیجہ بحث ۲۳
امامت کا توحید سے رابطہ ۲۴
مثال ۲۵
امام کی ضرورت ۲۶
کیا قرآن کافی نہیں ہے ۲۶
سچ بتائیں ۳۰
کردار امام (الف) ۳۱
کردار امام (ب) ۳۲

قیامت میں سایہ امامت ۳۳
دوگنی سزائیں ۳۴
ایک بہت ہی دلچسپ حدیث ۳۴
امام کی یاد ۳۵
امام کے معنی پر ایک نظر ۳۶
ایک دوسرا کردار امام ۳۶
حدیث میں کردار امام ۳۷
مقصد امام ۳۹
امام نے فرمایا ۴۰
دوسری جگہ فرماتے ہیں ۴۱

امام کی نشانیاں

علامتیں ۴۳
مثال ۴۴
اقوال رسولؐ اسلام ۴۹
کیوں رسولؐ کی تمام محنتیں بے کار گئیں ۵۲
جواب ۵۲
احقاق حق ۵۴
صفات امام ۵۵

عصمت ۵۵
کشادہ دلی ۵۶
عدالت ۵۷
امام اپنی ہوا وہوس پر قابو رکھتا ہو ۵۸
امام صاحب فضیلت ہو ۵۹

امام کے دوسرے صفات

قرآن کے مطابق حکم کرے ۶۰
امام مہربان ترین شخص ہو ۶۰
زھد و تقوی ۶۱
امام کے یہاں شک و تردید نہیں ہے ۶۲
امام پر ملامتیں اثر نہیں کرتی ہیں ۶۲
امام کو پیشگام ہونا چاہیے ۶۲
امام کو بے تکلف ہونا چاہیے ۶۳
امام چاپلوس نہ ہو ۶۴
امام تاریخ سے آگاہ ہو ۶۵
اپنے مقام سے ہوء استفادہ نہ کرے ۶۵
لوگوں کی شکایات کو پہنچے ۶۶
صبر و یقین ۶۶

آزادی ۶۶
مادی تو قعات نہ رکھتا ہو ۶۷
صفات امام کا دوسرا گوشہ ۶۷
امام کی صفتیں ۶۸
امام اور حقوق میں مساوات ۶۸
منافع اسلام کی حفاظت ۶۹

شیوۂ انتخاب

طریقہ تعیین رہبر و امام ۷۰
تلخ تجربے ۷۳
ہر فیصلہ حق نہیں ہوتا ۷۸
دنیا میں انتخاب کے طریقے ۷۹
تنہا خدا کی طرف سے امام کا انتخاب ہونا چاہئے ۸۰
تلخ تجربات ۸۱
ایک دلچسپ نکتہ ۸۵
ایک اور تلخ تجربہ ۸۶
انتخاب کے طبعی نقائص ۸۶
راہ حق ۸۸
ابوعلی سینا کا بیان ۸۸

وہ جگہیں جہاں انتخاب نہیں ہے ۸۹
انتخاب راہ حق ۹۰
بہترین شخص کا انتخاب ۹۲
ایک سوال ۹۳
جواب ۹۴

چند فضیلتیں

علیؑ اور اہلبیتؑ کے کچھ فضائل ۹۶
ایک اور داستان ۹۸
وہ کام جو ملائکہ بھی نہ کر سکیں ۹۹
امام کا گھر نزول ملائکہ کی جگہ ہے ۱۰۰
کیوں علیؑ کا نام قرآن میں نہیں ہے ۱۰۱
فضائل علیؑ کے گوشہ کی فہرست ۱۰۱

امام و امت کے حقوق

امام و امت کے متقابل حقوق ۱۰۳
امت کی ذمہ داریاں ۱۰۵
حج کا اہم ہدف ۱۰۶
تنوری شیعہ ۱۰۷

ایک جھوٹا شیعہ ۱۰۸
امامت معصومینؑ کی کیسے تضعیف ہوئی ۱۰۸

ستم بالائے ستم

مظالم ۱۰۹
اقتصادی ظلم ۱۰۹
تہمتیں ۱۰۹
رقیب تراشی ۱۱۰
فکری اور فرہنگی ظلم ۱۱۰
بہی خواہوں کو محروم کرنا ۱۱۰
جھوٹ باندھنا ۱۱۰
تحریف و توجیہ ۱۱۱
مسیر عوض کر دی گئی ۱۱۱
عالم کی جگہ جاہل ۱۱۱
کینے اور بہانے ۱۱۲
امام کی کنارہ کشی ۱۱۲
کیا امام کو چھوڑنے میں صلاح تھا ۱۱۳
کتنے ظلم ہوئے ۱۱۴
ثقافتی مظالم ۱۱۵

شیعوں پر مظالم اور تہمتیں ۱۱۶
کیا اکثر لوگ حق کو چھوڑ سکتے ہیں ۱۱۷
اس قدر نمازوں اور جہاد کے باوجود کیسے منحرف ہو سکتے ہیں ۱۱۸
شیعہ اور سنی نظرے ۱۱۸
صحیح اور غلط رہبری ۱۲۰
اولی الامر کون ہیں ۱۲۲

ولایت فقیہ ، راہ امامت کا ایک سلسلہ

ولایت فقیہ ۱۲۵
ولایت فقیہ کا کردار ، امامت کا کردار ہے ۱۲۶
ولایت فقیہ اور اس کا کردار ۱۲۷
کیا ولایت فقیہ کا قبول کرنا ، طاقت کے متعدد مرکز کا باعث ہے ۱۳۵

جزء دوم — عدل اور سماجی انصاف

عدل الٰہی ۱۳۷
خدا کے صفات سے متعلق ہماری شناخت ۱۳۹
عدل کو ہم اصول دین سے کیوں سمجھتے ہیں ۱۴۱
پہلا نکتہ ۱۴۳

عدل کے معنی ۱۴۳
دوسرا نکتہ ۱۴۶
تیسرا نکتہ ۱۵۲
عدل الٰہی سے متعلق سوالات کی تحقیق ۱۵۴
چوتھا نکتہ ۱۶۰
پانچواں نکتہ ۱۶۸
معاشرہ ساز فرق ۱۷۰
انسان کے ایجادات میں مشکلات کا حصہ ۱۷۵
چھٹا نکتہ ۱۷۶
ضروری توجہ ۱۸۱
بچے کا گناہ کیا ہے ۱۸۸
ایک بہترین سرگذشت ۱۹۲
تفاوت اور فرق خدا کو پہچاننے کا راز ہے ۱۹۴
سماجی انصاف ۱۹۵
عدل تمام منصوبوں کا تانا بانا ہے ۱۹۶
سماجی انصاف کا رابطہ الٰہی مکتب فکر سے ۱۹۷
عدالت بنیادی شرط ہے ۲۰۰
عدالت کی اہمیت اسلامی روایات میں ۲۰۱
عدالت کی اہمیت ۲۰۲
عدالت قائم کرنا انبیاءؑ کا ایک مقصد ۲۰۲

سماجی عدل و انصاف کے بعض نمونے ۲۰۴
وہ مقام جہاں عدالت اسلامی اموال کو ضبط کرتی ہے ۲۰۶
مُردوں کی اعداد شماری ۲۰۸
لوگوں کو خریدنے کا امامؑ کو مشورہ ۲۰۹
اسلام میں مساوات ۲۱۰
ایک غلط روش پر اعتراض ۲۱۱
مکتب فکر اور دکان رکھنے میں فرق ہے ۲۱۱
ایک روٹی کی عادلانہ تقسیم ۲۱۲
کچھ لوگوں کے لئے اعتقاد خراب نہ کریں ۲۱۳
ایک نامناسب توقع کا جواب ۲۱۴
فیصلوں کو سطحی طور پر نہ لیں ۲۱۵
جب مہمان کو بھی باہر کرتے ہیں ۲۱۵
قرآن مجید کا سخت اعتراض ۲۱۶
حضرت علیؑ کی عدالت کا ایک دوسرا نمونہ ۲۱۷
جو کام کوئی شخص نہیں کرتا ۲۱۷
امامؑ کی دقت نظر کا دوسرا نمونہ ۲۱۸
حضرت علیؑ پر غیر مناسب اعتراض ۲۱۹
عدالت رفتار میں ۲۲۰
کاغذ بازی نہ کریں ۲۲۰
اپنا حصہ بڑھانے کی کوشش ۲۲۱

عہدہ سے غلط فائدہ اٹھانا ممنوع ۲۲۲
اسلام میں برابری کا ایک اور نمونہ ۲۲۳
عزیز داری ممنوع ۲۲۳
حکومت اسلامی میں حکومت چلانے والے بھی کوڑے کھاتے ہیں ۲۲۴
منہ بند رکھنے کی قیمت دی جائے ۲۲۵
کمالات کی بناپر زیادہ حصہ نہیں لینا چاہیے ۲۲۶
امامؑ کا شدید اعتراض ۲۲۷
امامؑ کا عمر کو آگاہ کرنا ۲۲۷
امامؑ نے عدالت کو کیوں ترک کیا ۲۲۸
عدالت کے نمونہ ۲۲۹
بحث و عمل میں ضد ۲۲۹
عدالت کفار اور دشمنوں کی نسبت ۲۳۰
قرآن کریم میں منصفانہ قصاص ۲۳۶
عبادت میں میانہ روی ۲۳۷
تعریف و اعتراض میں میانہ روی اور عدالت ۲۳۸
عدالت، محبت اور اعتراض کے بارے میں ۲۳۸
اخراجات میں میانہ روی ۲۳۹
گھر کی چار دیواری میں عدالت ۲۴۰
اقتصاد میں عدالت ۲۴۱
کام کی مقدار ۲۴۱

تقسیم کرنے میں عدالت ۲۴۲
فائدہ اٹھانے اور خرچ کرنے میں عدالت ۲۴۳
پیغمبرؐ و ائمہؑ اور فقہاء، عدالتؑ کے محافظ ہیں ۲۴۴
مسلمان نماؤں کی پہچان ۲۴۵
فقیہ، سماجی عدالت پر حفاظت کا ذمہ دار ہے ۲۴۵
ولی فقیہ، سماجی عدالت کا مضبوط سہارا ہے ۲۴۶
خاتمہ ۲۴۸
ایک حقوقی داستان یا ایک فقہی قاعدہ ۲۴۸
عدالت سے انحراف کے عوامل ۲۴۹
وہ آیت جس نے پیغمبرؐ کو بوڑھا بنادیا ۲۵۲
سماجی عدالت کا قیام ایک عام نگرانی سے وابستہ ہے ۲۵۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

امامت

امامت شیعی مذہب کے نقطہ نظر سے دین کے اصول میں سے ہے۔ اگرچہ عالم اسلام میں دین کے اصول صرف توحید، نبوت، اور معاد یعنی قیامت میں ہی خلاصہ ہوتے ہیں لیکن جس طرح ہمارے یہاں توحید کے ساتھ عدل الٰہی بھی دین کی ایک اصل ہے۔ یوں ہی نبوت کے ساتھ امامت بھی اصول دین میں سے ہے اور درحقیقت امامت کے اعلان کی پہلی منزل سے یہ بات سامنے آجاتی ہے۔ امامت نتیجۂ رسالت، تکمیل دین اور اتمام نعمات الٰہی کا بنیادی ذریعہ اور سبب ہے اور اس کے بغیر نہ رسالت کامل ہو سکتی ہے اور نہ دین اسلام سے خدا راضی اور خوشنود ہوتا ہے۔

"غدیر خم" میں پیغمبر اکرمؐ کی جانب سے امامت کی پہلی فرد یعنی حضرت علی علیہ السلام کا اپنے جانشین کی حیثیت سے تعارف کرائے جانے کے بعد قرآن کریم اپنے الفاظ میں اسے دین کی تکمیل، نعمتوں کے تمام ہونے اور خدا کی رضا کا ذریعہ

یوں قرار دیا کہ ارشاد ہوا ، "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی رضیت لکم الاسلام دیناً " (سورہ مائدہ) قارئین کرام " امامت " کے موضوع پر سادہ اور عام فہم انداز میں لکھی گئی تحریر کو ضرور پسند فرمائیں گے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

عدل اور سماجی انصاف

عدل ہمارے شیعی اعتقادات میں ایک اصل کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ توحید ہی کی طرح عدل الٰہی کی اصل بھی اہمیت اور جامعیت کے اعتبار سے خاص مقام رکھتی ہے۔ اگر چہ عالم اسلام کا ایک بڑا طبقہ عدل الٰہی کو ایک اصل کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ یہ چیز صرف مذہب شیعہ کے خاص اعتقادات میں سے ہے، خدائے عادل و حکیم کی حکمت کا سرچشمہ یہ پوری کائنات اور اس کا عادلانہ و منظم نظام ہے جس میں ایک لمحہ کے ہزارویں حصہ میں بھی ظلم و بے عدالتی اور بے نظمی نہیں پائی جاتی۔

کائنات کا نظام عدل ہی اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ خدائے قدیر عادل ہے ..... قیامت میں بھی " بعض مکاتب فکر کے عقیدہ کے بر عکس من مانی نہیں کرے گا " بلکہ عدل کی بنیاد پر سب کا حساب و کتاب کرے گا۔

ہمارے نظریہ کے مطابق ہماری منظم اور انصاف کی بنیادوں پر استوار بہترین زندگی کا سرچشمہ بھی عدل الٰہی ہی ہے یہ واضح سی بات ہے کہ کیسی بھی انسانی معاشرہ میں نا انصافی اور ظلم کو برداشت نہیں کیا جاتا جب الٰہی فطرت پر خلق شدہ انسان عدل و انصاف کو پسند کرتا ہے تو کون سا ذہن یہ سوچ سکتا ہے کہ اس فطرت کا خالق خود ہی عادل نہ ہو ....

" عدل اور سماجی انصاف " اس موضوع پر آقائے قرائتی کی ایک دلکش تحریر ہے. جسے پڑھ کر قارئین کرام یقیناً مطمئن ہوں گے...

جناب آقائے قرائتی نے اس اصل کی روشنی میں جن نئے خطوط کی نشاندہی کی ہے ہمارا جوان علمی طبقہ ان سے ضرور فائدہ اٹھائے گا.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علی سیدنا محمد و اہل بیتہ و لعنۃ اللہ علی اعدائہم اجمعین

امامت

کیا امامت اصول دین میں ہے ؟

(لغت کی) کتاب مفردات میں امام کے معنی پیشوا کے ہیں اور جس کی پیروی کی جائے اس کو امام کہتے ہیں . خواہ وہ کتاب ہو یا انسان یا حق ہو یا باطل اور اس کی جمع آئمہ ہے .

اب جب کہ ہم میں امام کے معنی معلوم ہو گئے تو مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہیں اور یہاں چند آیات و روایات اور ان کے ترجمہ کو ہم نقل کرتے ہیں قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں .

۱ ۔ غدیر خم کے سلسلہ میں قرآن مجید حضرت محمد مصطفےؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے " یا ایھا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس ....." (مائدہ/۶۷)

اے رسولؐ ! جو کچھ " حکم " تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہو چکا ہے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو " سمجھ لو کہ " رسالت کا کوئی کام تم نے

انجام نہیں دیا ہے خداوند عالم تمہیں تمام احتمالی خطرات سے محفوظ رکھے گا۔
اس کے باوجود کہ سورہ مائدہ آخری سورہ ہے، جو آنحضرتؐ کی عمر شریف کے اواخر میں نازل ہوا ہے، اور باوجود اس کے کہ آپؐ متواتر کئی سالوں سے توحید، شرک، بت شکنی، رسالت، قیامت اور نماز سے متعلق مسائل لوگوں کو بتاتے آئے تھے، اور اس کے باوجود کہ جہاد، روزہ، خمس اور زکوۃ کا حکم ۲ھ میں آچکا تھا۔
لیکن اب جب کہ آپؐ کی عمر کے آخری ایام ہیں اور ۱۰ھ ہے سورہ مائدہ نازل ہوتا ہے اور اس طرح رسولؐ کو تہدید و تاکید کرتا ہے۔
اور اس کے باوجود کہ رسولؐ ایک بزدل اور ڈرپوک انسان نہیں تھے ورنہ اگر ڈرنا ہی تھا تو بعثت کے شروع کے سالوں میں ڈرتے کیونکہ آپ تنہا تھے مگر زندگی آخری مرحلہ میں تو ہزاروں محبت کرنے والے موجود تھے، اور آیت میں ارشاد ہے کہ ڈرو نہیں، ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔
اور اس کے باوجود کہ جحفہ قافلوں کے جدا ہونے کی جگہ ہے، موسم اور ہوا شدید گرم ہے اور رسولؐ کی عمر کا آخری سال ہے، ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو پیغام رسولؐ کو پہنچانا ہے ایک ایسے موضوع کے سلسلہ میں ہے کہ آنحضرتؐ منافقین شدید مخالفت سے ہراساں ہیں۔
جی ہاں ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مذکورہ آیت (مائدہ/ ۶۷) کسی اہم پیغام کے بارے میں ہے اور وہ پیغام رسول خداؐ کی

جانشینی اور امت اسلامی کے لئے معصوم رہبری کا مسئلہ ہے اصحاب رسول خداؐ میں سے بہت سے لوگوں نے جنمیں تمام مسلمان بھی مانتے ہیں اس واقعہ کو نقل اور بیان کیا ہے کہ یہ آیت ماجرائے غدیر خم اور مسئلہ جانشینی سے متعلق ہے، البتہ بیشتر آشنائی کے لئے کتاب الغدیر اور فارسی زبان جانے والے برادران، تفسیر نمونہ جلد پنجم کے صفحہ ۵ پر رجوع کرسکتے ہیں.

امامت اصول دین میں ہے

۱۔ جو چیز ہماری نظر میں ہے وہ یہ کہ خداوند عالم پیغمبر اسلامؐ کو تنبیہ اور تہدید کرتا ہے کہ (اے رسولؐ) اگر حق کے جانشین کی معرفی اور نصب کرنے میں ذرا بھی کوتاہی، اور منافقین کی مخالفت کی وجہ سے تساہلی کی تو گویا الہی رسالت کا کوئی کام انجام ہی نہیں دیا ہے.

لہذا ہم کو آیت کے لب و لہجہ اور رسول اکرمؐ کی جانشینی سے متعلق تمام حکم الہیٰ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ امامت اصول دین سے ہے.

۲۔ وسائل الشیعہ جلد اول کی ۳۹ ویں حدیث اور کتاب ستررک کی ۱۷ ویں حدیث میں ہے کہ بناء و اساس اسلام چند چیزوں پر قائم ہے جن میں سے اساسی ترین ولایت و رہبری ہے اور ہم اس کی بعض تعبیرات سے ایک گوشہ یہاں بیان کرتے ہیں:

الف۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: اسلام کی بنیاد نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور ولایت پر قائم ہے. امام محمد باقرؑ کے خاص صحابی زرارہ نے پوچھا

ان میں سے کونسا ستون اہم ہے ؟

امام نے فرمایا : ولایت سب سے اہم ہے ۔ اور اس کی علت آپ بیان فرماتے ہیں، " لانها مفتاحهن والوالی هو الدلیل علیهن "

کیونکہ ولایت ، نماز ، روزہ اور حج کی کنجی ہے اور ان تمام مسائل کی رہبری ولی کرتا ہے ۔ البتہ ولایت سے مراد امام معصوم کی اطاعت ہے اس لئے کہ بعض روایات میں کلمہ ولایت کی جگہ اطاعت امام کے لفظ آئے ہے ۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نماز ، روزہ حج و زکوۃ میں سے ہر ایک جسمانی اور مالی امکانات نہ ہونے کے سبب قابل تعریف ہیں لیکن رہبری حق کے قبول کرنے کا مسئلہ ہر حال میں کرنا ہے وہ قابل تعریف نہیں ہے ۔۔

اس کے علاوہ حضرت رسول اکرمؐ نے نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کا موضوع بیان کرنے کے سلسلہ میں لوگوں کو جمع کرکے مجمع عام میں فریاد نہیں کی ہے لیکن امام کی معرفی اور نصب کرنے کے سلسلہ میں غدیر خم کے چٹیل میدان میں مرکز یت اور اجتماع مردم کی خاطر مدتوں صبر کیا ہے اور جیسے ہی ایک جگہ سب لوگ جمع ہوئے معصوم کی رھبریت کا مسئلہ بیان کردیا ہے ۔

چھوٹے لوگوں نے اصلی مسئلہ سے گریز کیا ہے ۔ میری یاد داشت سے کبھی حذف نہ ہوگا کہ جب میں خانہ خدا کا طواف کررہا تھا تو میں نے کعبہ پر نگاہ کی اور سوچ میں ڈوب گیا کہ یہ کعبہ مادر علیؑ کا زچہ خانہ اور حضرت علیؑ کا گہوارہ ہے اور یہ حضرت علیؑ ہی تھے کہ جنھوں نے باب کعبہ سے بتوں کو اوندھے منھ گرایا ہے ،

اس کے بعد میں نے طواف کرنے والوں پر نظر دوڑائی کہ کیسے لوگوں نے نومولود بچہ کو گہوارہ سے نکال باہر پھینکا ہے اور گہوارہ کا چکر کاٹ رہے ہیں۔

۳۔ تیسری دلیل جو اہمیت امامت پر پیش کی جاسکتی ہے ایک معروف حدیث ہے کہ " من مات و لم یعرف امام زمانہ مات میتۃ الجاھلیۃ " (جو شخص مرجائے اور اپنے امام یا اس کی راہ و روش کی نسبت کوئی آشنائی نہ رکھتا ہوگویا وہ جاھلیت کی موت اور ظہور اسلام سے پہلے دنیا سے چلا گیا ہے)۔

۴۔ اصول کافی ج ۳ میں ہے کہ جو لوگ اپنے رہبر حق کی معرفت کے بغیر زحمت اٹھاتے اور اعمال بجالاتے ہیں۔ ہرگز (وہ لوگ یا ان کے اعمال) خدا کو قبول نہیں ہیں۔ وہ مثل اس شخص کے ہیں جو کسی حکم کے بغیر کسی ادارہ کے لئے کچھ چیزوں کی خریداری کرے تو وہ ہرگز مسئولین کی طرف سے کسی مہربانی و لطف کا مستحق نہ ہو گا۔ جی ہاں اسلام میں اہداف جوش و جذبات اور رھبریت جیسے مسائل کو اصالت اور فوق العادہ اہمیت دی گئی ہے۔

نتیجۂ بحث

میرے عزیز قارئین ۔ مذکورہ چاروں دلیلوں پر اجمالی نظر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آیا اسلام میں رہبریت کا مسئلہ اصول دین میں ہے یا فروع دین میں زیادہ دور نہ جائیں توحید زمانی ایک ایسی توحید ہے کہ معاشرہ کا حاکم ایک معصوم رھبر ہونا چاہیے ورنہ توحید کے بجائے طاغوت پلیں گے۔ نبوت اور انبیاءؑ کا قانون اس وقت تک اپنی جگہ پر قائم ہے کہ جب تک اس کی حفاظت معصوم رہبر کرے ورنہ

آسمانی تمام قوانین خرافات، تحریفات، بدعتوں اور شخص سلیقوں سے مخلوط ہو کے رہ جائیں گے اور وحی آسمانی کا کوئی اعتبار نہ ہو گا۔

قیامت کو سمجھنا اور اس کے ملکوتی مسائل پر آگاہی پیدا کرنا بھی سوائے امام کے ممکن نہیں ہے اگر ہم اپنی عقل سے کام لیں تو اتنا سمجھ میں آئے گا کہ معاشرہ قانون اور رھبریت کے بغیر کسی جنگل کے برابر ہے۔ قانون اور رھبریت ایک دوسرے سے جدا ہونے کے قابل نہیں ہیں لہذا اس لحاظ سے نظام معاشرہ اور قوانین کی پائداری و حفاظت کے سلسلہ میں مسئلہ امامت و رہبری اور اس کے کردار میں کسی طرح کی جاے تردید اور گفتگو نہیں ہے۔

امامت کا توحید سے رابطہ

جس وقت حضرت امام رضا علیہ السلام شہر نیشاپور سے گذر رہے تھے تو چاہنے والے آپ کے پاس آئے اور ایک حدیث بیان کرنے کی درخواست کی تو امام نے وہ حدیث بیان فرمائی آپ نے اپنے پدر بزگوار سے اور انھوں نے اپنے پدر بزر گوار سے یہاں تک کہ رسول اکرمؐ نے جبرئیل سے اور انھوں نے خدا وند عالم سے میں طرح نقل کیا: " کلمة لا اله الا الله حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی" (توحید میرا قلعہ ہے جو شخص اس میں داخل ہو گیا میرے عذاب سے بچ گیا۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے یہ حدیث نقل فرمائی اور روانہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی دور چلے ہو نگے کہ لوگوں نے دیکھا کہ امام فرما رہے ہیں: "بشروطھاوانامن شروطھا" (بحار ج ۳ جدید ایڈیشن)۔

توحید اپنی کچھ شرائط کے ساتھ الٰہی قلعہ ہے اور میں ان شرائط میں سے ایک ہوں۔ یہاں امام نے توحید و امامت کے درمیان شرط و شروط کا رابطہ قرار دیا ہے۔ ایسا رابطہ جو گاڑی اور اس کے پہیوں کے درمیان ہوتا ہے یا وضو اور نماز کے درمیان ہوتا ہے، پس امامت کے بغیر لوگوں کی توحید کا عقیدہ خطرہ میں ہے جب تک توحید ہے معصوم کی رہبری بھی ہے اور وہ بھی ایک زندہ و رہبری۔

مثال

اگر ڈاکٹر اپنے مریض کو حکم دے کہ اس انجکشن کو یا فلاں ٹیبلیٹ کو کھاؤ تو مریض ڈاکٹر کے اس طرح کہنے سے سمجھ جائے گا کہ ضرور ٹابلیٹ اور انجکشن کی ترکیبی کیفیت کا اثر ایک ہے کیونکہ دونوں کا نتیجہ وہی بہبودی اور سلامتی ہے۔

کتاب تفسیر نور الثقلین اور بحار الانوار میں یہ حدیث موجود ہے، "ولایۃ علی بن ابیطالب حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی" (سفینۃ البحار کلمہ "ولی") حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی رہبری خدا کا قلعہ ہے جو شخص اس میں داخل ہو گا عذاب سے بچ جائے گا۔

توجہ کریں کہ توحید کی بھی تعبیر قلعہ سے ہوئی ہے اور ولایۃ علی ابن ابی طالبؑ کی بھی تعبیر قلعہ سے کی ہے اور دونوں کا نتیجہ بھی ایک ہے جو خدا کے عذاب سے نجات ہے۔ اس ایک تعبیر سے امامت اور توحید کے درمیان کسی گہرے رابطہ کا پتہ چلتا ہے۔ جی ہاں اگر ہم نے حضرت علیؑ کی رہبری کو قبول کر لیا تو وہ ہم میں خدا کی طرف دعوت دیں گے اور اگر ہم نے خدا سے رہبری مانگی تو وہ علیؑ کی رہبری کی

طرف ہماری رہنمائی کرے گا.

امام کی ضرورت

جس دلیل سے ہمیں کسی رسول کی ضرورت ہے اسی دلیل سے ہم میں امام کی بھی ضرورت ہے اگر انسان ہدایت پانے میں خود کفیل ہوتا تو انبیاءؑ کی اسے ضرورت نہ ہوتی ، ہم نے اس سے قبل کے مسودہ میں جو نبوت سے متعلق تھا کچھ دلائل بیان کئے ہیں.

کیا قرآن کافی نہیں ہے ؟

قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ تمام لوگ اور فرقے اس کی آیتوں کو ایک وسیلہ کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ہر گروہ اس سے اپنے فائدہ کی چیز اخذ کرکے استدلال کرتا ہے تو اس حالت میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کسی امام کے بغیر معاشرہ کی اصلاح میں کافی ہے ؟

کیا طبی کتاب کسی ڈاکٹر کے بغیر مریضوں کا علاج کر سکتی ہے ؟!

کیا قانون کسی حاکم ، اور قانون شناس کے بغیر تنہا کافی ہے ؟

کیا ہر ایڈیو لوجر نہیں چاہتی ہے ؟!

کیا قبول کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی خلقت کا مقصد تو عبادت اور خدا کے راستہ پر گامزن ہونا ہو لیکن اس سلسلہ میں کوئی راہ شناسی درکار نہ ہو ؟!

کیا قبول کیا جاسکتا ہے کہ انسان ، ایک انسانی بلند مقام پر پہنچنے کا عاشق تو ہو

لیکن خارج میں ایسا کوئی معشوق نہ پایا جاتا ہو؟!

کیا ایسا نہیں ہے۔کہ ہر باطنی احساس کیلئے ایک ظاہری اور خارجی واقعیت پائی جاتی ہے جس کا وہ احساس کرتی ہے مثلاً اگر ہم اپنے اندر تشنگی کا احساس کرتے ہیں تو ہمارے بدن سے الگ خارج میں پانی موجود ہے جو اس احساس کا جواب ہے۔ گویا آپ اپنے تمام باطنی احساسات کیلئے جواب تلاش کر لیتے ہیں ہم کیسے قبول کریں کہ انسان کے اندر کمال اور سعادت کی بلندیوں پر پہونچنے کی خواہش تو ہو لیکن وہ چیز جو اس ضرورت کا جواب ہے ذھن سے باہر نہ پائی جاتی ہو؟ کیسے قبول کیا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص لوگوں کو دعوت دے لیکن گھر کا ایڈریس نہ بتائے یا کسی راھنما کو نہ بھیجے خصوصاً جب کہ ایڈریس پیچیدہ ہو اور راستہ میں کچھ لوگ کھڑے ہوں جو مہمانوں کو میزبان کے گھر سے دور اور گمراہ کررہے ہوں۔

ایسی صورت میں ضروری ہے کہ میزبان اپنے مہمانوں کے لئے رہنما بھیجے اور وہ بھی ایسا جو مکمل طور پر راستے سے واقف ہو اور راستہ میں گمراہ کرنے والوں کے شر سے نجات دلا سکے۔

ہم کیسے قبول کریں کہ انسان زندگی کی سادہ اور حساس راہوں میں گمراہ ہوتا ہے تو اسے راھنما کی ضرورت ہوتی ہے لیکن آسمانی، معنوی اور سعادت کی راہوں کو طے کرنے اور رشد واقعی کو پہنچنے میں اسے کسی راہنما کی ضرورت نہ ہو جب کہ یہ راہ پیچیدہ اور انسان کا علم اس کے بارے میں کم اور شیطانی وسوسے زیادہ ہیں۔

کیا آج تک آپ نے کوئی ایسا معاشرہ دیکھا یا سنا ہے جو کسی رہبر کی ضرورت

محسوس کرتا ہو اور نہ ہی اس نے اپنے لئے کسی رہبر کو چنا ہو ؟

کیا ایسا نہیں ہے کہ حیوانات جس وقت اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں تو انھیں بھی ایک رہبر کی ضرورت ہوتی ہے ، جیسے شہد کی مکھیاں جو اپنے لئے ایک ملکہ کا انتخاب کرتی ہیں ۔

تاریخ سیاست اور جنگ و جدال میں کونسی ایسی کامیابی کو آپ جانتے ہیں جس میں کسی رہبر نے اپنا کردار ادا نہ کیا ہو ؟

امام کے بغیر معاشرہ ہرج و مرج کا شکار ہوتا ہے اور اس کو کونسی عقل اور وجدان قبول کر سکتا ہے ؟

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں ، " لا بد للناس من امیر برا کان او فاجرا " ہر معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی رہبر رکھتا ہو خواہ وہ رہبر نیک ہو یا فاجر بہر حال ہرج و مرج سے بچنے کیلئے ایک امیر اور رہبر کا ہونا ضروری ہے۔

ہم کو ضرورت امام کے بارے میں بحث نہیں کرنا چاہیے اس لئے کہ یہ سورج کو چراغ اور واضحات کی گویا و ضاحت کرنا ہے ، بلکہ ہمیں رہبر کی صفات اور شرائط کے بارے میں تحقیق کرنا چاہیے ، اور اس کے معیار انتخاب کو محو گفتگو قرار دینا چاہیے اور یہ کو . نصب و معزول کے موارد و شرائط کیا ہیں با طل رہبروں کے مقابل رہبر حق کو کیسے پہچانا جاسکتا ہے .

لہذا ضرورت امام پر ہم سر سری نظر ڈالیں گے اس لئے کہ کچھ باتیں ہیں جنھیں بیان کرنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ضرورت امام پر بحث نہیں ہے (جسے بیان کیا

جائے) اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اجتماعی زندگی امام اور رھبر کے بغیر دوام نہیں رکھتی ہے ضرورت امام کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اس لئے کہ سب جانتے ہیں کہ الہیٰ قوانین کے اجراء اور خدا کے احکام کی حفاظت کرنے کے لئے (کسی) طاقت اور حکومت کی ضرورت ہے اور طاقت و حکومت ایک لائق امام چاہتی ہے، امام کی ضرورت کے بارے میں خصوصاً اس وقت کوئی شبہ اور تردید نہیں ہے کہ جب انسان کی رسائی رسولؐ تک نہ ہو اور وہ آنحضرتؐ کی خاتمیت کو قبول کر چکا ہو۔ کیا ہو سکتا ہے کہ خدا لوگوں کے لئے رسول بھیجے اور وہ رسول خون دل پی کر احکام و قوانین کو نافذ کرے اور پھر سب کو چھوڑ کر دنیا سے چلا جائے، کیا یہ کام حکیمانہ ہے ؟ کیا جس رسولؐ کو ہم نے امت کی ھدایت و پھلائی کے سلسلہ میں حریص اور اپنے دل کو جلاتے ہوئے دیکھا ہو اس کا اس طرح چلے جانا مناسب ہے ؟!

سچ بتائیں جو لوگ کہتے ہیں کہ رسولؐ نے اتنی زحمتوں کے بعد ایک مکتب کی بنیاد رکھی ہے اور پھر ایسے ہی چلے گئے .

وہ کس طرح خدا کی حکمت اور رسولؐ کی زحمتوں کا جواب دیں گے اور کون سا ذمہ دار شخص ہے جو اس طرح لوگوں کو چھوڑ سکتا ہے ؟!!

اصلاً اسلام یا باطنی چاہت اور خارجی و ظاہری حوادث کے موافق ہو یا پھر یہ کہ کتابوں میں کچھ خشک قوانین ہوں جو ہر دور زمانہ سے فراموش ہو جائیں ؟

پہلی صورت ہو گی ورنہ دوسری صورت ہوگی . اسی وجہ سے حضرت امام رضا

علیہ السلام فرماتے ہیں: " ان الامامة نظام الدین و نظام المسلمین اس الاسلام النامی " (سفینۃ البحار "امم") رھبری حق کی وجہ سے مکتب و دین پائیدار ہے اسلامی معاشرہ ایک نظام کا مالک ہے اور ترقی یافتہ اسلام کی پاس امامت ہے، جو قافلہ بشریت کی تمام مادی و معنوی اور انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے اسلام نامی سے رضاؑ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام، امام کے بغیر رشد و نمو حاصل نہیں کرسکتا ہے بلکہ زوال پا سکتا ہے.

جی ہاں حقیقت بھی یہی ہے اس لئے کہ ہر روز، ہر مہینے اور ہر سال انسانی معاشرہ نہ جانے کتنے حوادث سے دوچار ہو تا ہے کہ اگر قانون الہی اور خدا کا اور حکم رہبری حق نہ ہو تو لوگ ان حوادث میں اپنا آرام بھی کھو بیٹھیں گے اور ہر شخص ایک نیا راستہ اختیار کرے گا. اور پھر اسلامی نظام ھرج و مرج کا شکار ہو گا، لہذا دین کے ساتھ رہبر کا ہونا ضروری ہے.

سچ بتائیں؟

کیا کسی بڑے حوض میں تیرنا کسی مربی اور نجات دھندہ کا محتاج نہیں ہے؟ کیا دریا میں کشتی کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا بقول امامؑ دنیا " بحر عمیق" اور دریائے پر تلاطم نہیں ہے، اور کیا آئمۂ معصومین علیہم السلام کشتی نجات نہیں ہیں؟

کیسے ہو سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس دنیا کو مثل ایک دریا کے پیدا تو کرے لیکن لوگوں کو اس میں تیرنے والوں کی طرح دیکھتا رہے (اور کچھ نہ کرے) جب کہ روزانہ اس میں ہزاروں لوگ ڈوب جاتے ہوں؟

دریا بھی ایسا دریا کہ جو گرداب رکھتا ہو ، حیوان رکھتا ہو ، وحشت رکھتا ہو، حیران و پریشان کنندہ ہو اور اس میں تیرنے والوں کو گہرائی ، ڈسنے والے جانوروں اور اس کے خطرات کی خبر تک نہ ہو ، بھلا کیسے خدائے حکیم اس دریا (دنیا) میں تیرنے والوں کو اپنے حال پر چھوڑ سکتا ہے ؟ یہ خدا کی کونسی منطق اور حکمت سے زیب دیتا ہے ؟

ایک منٹ کے لئے سوچ لینا ہمارے لئے ایک معصوم رہبر کی ضرورت کو روشن کر سکتا ہے .

کیسے خدا نے ملک کا حاکم عقل کو حاکم قرار دے . جس کے ذریعہ آنکھیں اور کان تو انحراف و خطا سے محفوظ ہو جائیں لیکن ایک معاشرہ کے لئے خدا کی طرف سے کوئی امام رہنمائی اور حل اختلافات کے لئے معین نہ ہو ؟

کردار امام (الف)

تمام موجودات کی خلقت کی اور غرض، انسان کا ان سے بہرہ مند ہونا [۱] اس لحاظ سے گویا انسان گلدستہ ، موجودات کا ایک اہم پھول ہے.

انسان کی خلقت کی غرض خدا کی عبادت اور اس کی طرف حرکت کرنا بھی ہے اور ہر حرکت کے لئے خواہ مادی ہو یا معنوی چند چیزوں کی ضرورت ہے ،

۱ ۔ راہ ۲ ۔ وسیلہ

۳ ۔ غرض ۴ ۔ رہبر

لیکن ان چاروں چیزوں میں تمام کی نسبت رہبر زیادہ اہم ہے اسلئے کہ اگر

رہبر اور راہنما نہ ہو تو ہم راستہ بھی بھول سکتے ہیں. اور ہدف و مقصد بھی اور وسیلہ بھی بے کار پڑا رہ سکتا ہے. بنا بر این تمام موجودات ہمارے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہم خدا کی طرف حرکت اور عبادت کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور خدا کی طرف حرکت ایک راھنما کی محتاج ہے اور امام اس حرکت کا راھنما ہے.

کردار امام (ب)

انسان کو نمونہ اور الگو کی ضرورت ہے ، اسے جاننا چاہیے کہ کہاں جارہا ہے کس کے مانند ہوگیا ہے ،کس کے مثل ہے اور کس کے مانند ہونا چاہیے امام ایک ایسا انسان ہے کہ تمام انسانوں کو اس کے مثل ہونا چاہیے.

امام ایک نمونہ ہے، شاہکار ہے، الگو ہے، میزان اور کسوٹی ہے .بے نمونہ اور بے امام انسان سرگرداں ہوتا ہے.

اگر ان نمونوں کی حق کی جانب سے معرفی نہ ہو تو باطنی ہوا و ہوس اور بیرونی استعماری ہاتھ ہمارے لئے نمونے تراش کر ڈالیں گے ،اگر ہم ہر ایک نشست و برخواست میں اپنے حقیقی نمونوں کے نام اور فضائل بیان نہ کریں اور ان بزرگواروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم اور ان سے عشق نہ کریں تو لوگ تبلیغات کے ذریعہ دوسروں کے نام ہم میں پیش کر ڈالیں گے اور ہمارے دل

۱۔اس سلسلہ میں قرآن کے اندر بہت سی آیات موجود ہیں مثلاً خدا فرماتا ہے :" خلق لکم ما فی الارض جمیعا " (بقرہ ۲۹) جو کچھ زمین میں ہے وہ سب میں نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے یا جیسے "سخر لکم اللیل والنھار و الشمس والقمر" (نحل/ ۱۲) خدا نے چاند سورج اور رات ، دن کو تمہارے فائدے کیلئے پیدا کیا ہے

ان کی محبت سے بھر دیں گے اور ہم کو ان کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے لوگوں کی شخصیت کے صرف اس پہلو کو ذکر کیا ہے جو دوسروں کیلئے نمونہ بن سکتا ہو جیسے جناب ابراھیم ؑ کی بت شکنی یا ان کی مجاز آرائی کا ذکر کیا اور بیوی کے نام، تعداد فرزند اور تاریخ تولد و وفات کا ذکر نہیں کیا

امام تنہا راھنما ہی نہیں ہے بلکہ وہ امام ہے، تنہا سرپرست ہی نہیں ہے بلکہ وہ امام ہے یعنی وہ ہمارے لئے تمام کاموں مثلاً عبادت کرنے کھانے پینے، لڑائی جھگڑے، میں نمونہ ہے۔

امام گفتگو اور اقوال کو تصویری کی صورت سے عینیت عطا کرتا ہے،

یہ امام ہی تو جاننا ہے کہ اسلام کسی ذھن کی ایجاد نہیں ہے بلکہ خارجی حقیقت ہے، تصور نہیں ہے بلکہ واقعیت ہے، خیال نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے، اسم نہیں ہے بلکہ اسم با مسمی ہے۔

امام اپنی تمام صفات و افکار و اعمال کے ساتھ ہر جگہ امام ہے، ہر وقت امام ہے یعنی آج بھی جناب ابرھیم ؑ ہمارے لئے امام ہیں۔

قیامت میں سایہ امامت

قرآن میں ارشاد ہے "یوم ندعوا کل اناس بامامھم" (احزاب/ ۳۰) (روز قیامت ہر ایک گروہ کو اس کے اپنے امام اور رہبر کے ساتھ آواز دی جائے گی) اس آیت سے پیروی کرنے والوں کی ہدایت و گمراہی کے بارے میں وجود اور ضرورت امام اچھی طرح روشن ہے۔

دوگنی سزائیں

قرآن رسولؐ کی ازواج کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے ، اگر تم میں سے کوئی کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو وہ دوسری عورتوں کی نسبت دو گناہ عذاب میں مبتلا ہوگا اور وہ اس لئے ہے کہ رسولؐ کی زوجہ کو دوسری عورتوں کے لئے الگو اور نمونہ ہونا چاہیے اور فریضۂ رہبری کو ادا کرنا چاہیے ۔ (سورہ احزاب آیت ۳۰)

حدیث میں ہے کہ ، اس سے پہلے کہ عالم کا ایک گناہ بخشا جائے جاہل کے ستر گناہ بخش دیئے جائیں گے ۔ (تحف العقول/ صفحہ ۵۰۸/) جی ہاں عالم معاشرہ میں لوگوں کے لئے نمونہ ہے اس کی خطا بھی بزرگ شمار کی جاتی ہے ۔

بعض ہمارے بزرگ فرماتے ہیں ، کہ اگر عالم اور ایک دانشمند گناہ صغیرہ کرے تو اس کا یہ گناہ ، گناہ کبیرہ شمار ہوگا اس لئے کہ اس کا یہ عمل دوسروں پر اثر کرے گا ۔ کہ یہ ہم کو دیکھتے ہیں کہ بدعت گذاروں اور ان لوگوں کا گناہ کہ جو معاشرہ میں غلط پروگراموں کے موسسین اور سبقت کرنے والے ہیں ، دوسروں کی نسبت دو گناہ ہے وہ اسی لئے ہے کہ یہ لوگ امام فاسد کا فریضہ ادا کرتے ہیں ۔

ایک بہت ہی دلچسپ حدیث

حضرت امام ھادی علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ کیوں حضرت علی علیہ السلام جنگ جمل میں زخمی ہو جانے والے شخص کو رہا کر دیا کرتے تھے لیکن جنگ صفین میں زخمیوں کو بھی قتل کرتے تھے ؟

جواب میں امام نے یہ فرمایا، جنگ صفین میں مخالفین کا رہبر زندہ تھا، فرار ہونے والے زخمی اس کے پاس دوبارہ جمع ہوتے، اپنی خامیوں کو پورا اور کمزوریوں کو تقویت پہونچاتے تھے اور مریضوں کی عیادت اور دلجوئی کرتے تھے گویا فساد کی جڑیں مضبوط تھیں (اور جب تک جڑیں ہوتی ہیں، شر کو کی توقع ہوتی ہے) لہذا فساد کو ختم کرنے کے لئے تمام کو قتل کرنا چاہیے۔

لیکن جنگ جمل میں بڑے بڑے لوگوں مثل طلحہ و زبیر کے قتل اور عائشہ کے اونٹ کے پیر کے کٹنے کے بعد فریب کھانے والے زخمی اور فراری لوگوں کے لئے کوئی امید اور پناہ گاہ نہ تھی لہذا جو زخمی بھاگ کھڑا ہوا حضرتؑ نے اس کا تعاقب نہیں کیا (تحف العقول / ص ۵۰۸) اس واقعہ سے خوب اچھی طرح رہبریت کا نقشہ باطل جنگی میدانوں میں کھینچا اور عکس اعمل کا فرق حق کے جنگی میدانوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

امام کی یاد

استعماری قوتوں کے نفوذ کی بزرگترین راہیں ہمارے جوانوں کو اماموں اور اپنے نمونہ افراد سے دور اور دوسروں سے انکے ذہنوں کو پر کرنا ہے اور شاید امام کی زیارت کے فلسفوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان جو کچھ بھی ہو، ایک ایسے انسان کے پاس جائے جسکے مانند اسے ہونا چاہیے اور فاصلوں کو ختم اور خامیوں کو پورا کرے۔ شاید حضرت امام حسینؑ کی عزاداری کے فلسفوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان (فرش عزا) پر بیٹھے اور اپنے رہبروں کے صبر و استقامت کا تذکرہ سنے اور اپنے سے موازنہ

کرے اور سوچے کس طرح مرنا اور جینا چاہیے اور کونسی راہ اختیار کرنا چاہیے۔

امام کے معنی پر ایک نظر

کتنی دلچسپ تعبیر ہے اور کتنا عظیم مقام ہے اور کتنا خوبصورت کلمہ ہے لفظ امام، یہ لفظ جتنا جامع ہے اتنا دوسرے الفاظ نہیں ہیں جیسے معلم، مرشد، ہادی، مبلغ اور واعظ، اس لئے کہ یہ تمام الفاظ ارشاد پر دلالت کرتے ہیں نہ کہ پیشوائی پر۔

ایک دوسرا کردار امام

ایک جنگ میں جس میں عمر چاہتے تھے کہ خود میدان میں جائیں حضرت علی علیہ السلام نے ان کو منع کیا اور فرمایا کہ تم اب خلیفہ ہو اگر تم میدان جنگ میں چلے گئے تو دشمن آپس میں کہیں گے کہ مسلمانوں کے پاس اب کوئی نہیں رہا ہے جو کچھ تھا وہ ساتھ لے آئے ہیں یہاں تک کہ اپنے خلیفہ کو بھی لے آئے ہیں اس طرح جو رعب و دبدبہ ان پر ہمارا ہونا چاہیے وہ ختم ہو جائے گا۔

روز قیامت مستضعفین اپنے رہبروں سے کہیں گے، " لولا انتم لکنا مومنین " (سورہ سباء / ۳۱) (اگر تم لوگ نہ ہوتے اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑا ہوتا تو ہم اپنی فطرت کے مطابق مومن ہوتے) سورہ توبہ میں مسلمانوں کو حکم ہوتا ہے کہ وہ میدان جہاد میں کفر کے بانی اور رہبروں کو اپنا ہدف بنائیں " فقاتلوا ائمة الکفر " (توبہ / ۱۲)۔

ہم اپنے اماموں کے زرین اقوال اٹھا کے پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

لوگ اپنے ماں باپ سے زیادہ رہبر سے متاثر ہوتے ہیں پیشواو ائمہ کفر سے جنگ کرو۔ حضرت علیؑ فرماتے ہے: " الناس بامراھم اشبہ منھم با بایھم" (بحار جلد ۸، صفحہ ۴۶) ایک دوسرا معروف جملہ ہے: " الناس علی دین ملو کھم " (لوگ اپنے ملوک اور بادشاہوں کے دین کے مطابق چلتے ہیں)

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ " صنفان من امتی اذاصلحا صلحت امتی واذا فسدا فسدت امتی الفقھاء والامراء۔" (قصار الجمل مادہ امر")

(جب کبھی بھی میری امت کے دوگروہ فاسد ہو جائیں تو تمام (لوگ) فاسد ہوجائیں گے اور اگر وہ دونوں نیک ہو جائیں تو تمام (لوگ) نیک ہو جائیں گے اور وہ دو گروہ امراء اور فقہاء کے ہیں۔)

ان تمام مطالب کے بیان کرنے سے ہر شخص کے لئے کردار امام روشن ہو جاتا ہے۔

حدیث میں کردار امام

اصول کافی میں ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

" قال اللہ تبارک و تعالی لا عذبن کل رعیۃ فی الاسلام دانت بولایہ کل امام جائرلیس من اللہ وان کانت الرعیہ فی اعمالھا برہ تقیہ و لا عفون عن کل رعیہ فی الاسلام دانت بولایہ کل امام عادل من اللہ وان کانت الرعیہ فی انفسھا ظالمہ مسیہ" اصول کافی / ج ۱ / ص ۳۷۶ / حدیث ۴) (اس حدیث میں امامؑ خداوند عالم کے قول کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہر وہ گروہ اور لوگ جو کسی ظالم ستمگر رہبر کو مانتے ہوں میں ان کو ضرور عذاب کروں گا اگر چہ وہ لوگ متقی و پرہیز

گار اور ان کے اعمال نیک ہوں لیکن اس کے برعکس جب بھی لوگ خدا کی طرف سے ایک عادل امام کی رہبری کو قبول کریں تو میرا لطف و کرم اور بخشش ان کے شامل حال ہوگی اگرچہ انھوں نے اپنی نسبت ظلم کیا ہو اور برے راستہ پر گامزن ہوں)

اس حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز عمل سے بھی مہم اور بڑھکر ہے وہ راہ (ولایت) ہے . اس حدیث کی وضاحت کے لئے ایک مثال پر توجہ فرمائیں ، جب کبھی بھی گاڑی کا ڈرائیور تجربہ کار ، عاقل اور صحیح وسالم ہو تو گاڑی منزل مقصود تک پہونچ جائے گی اگرچہ اس کے بعض مسافروں نے سنترے (اور مونگ پھلی) کے چھلکے اور سگریٹ پی پی کر گاڑی کو بھردیا ہو یا مسافر پھٹے پرانے کپڑے اور جوتے پہنے بیٹھیں ہوں لیکن چونکہ ڈرائیور سالم اور تجربہ کار ہے سفر اچھا ہوگا۔

لیکن اگر خود گاڑی کا ڈرائیور اور راہنما ایک دیوانہ ، مست یا اندھا شخص ہو تو ان مسافروں کا انجام موت ہے . اگر چہ مسافر اچھے اچھے کپڑے اور جوتے پہنے ہوں ، جی ہاں جو چیز حرکت کرنے میں اصل ہے وہ رہبریت اور راہ ولایت ہے نہ کہ قیافہ اور ہیکل اور جزئی اعمال [1] (جو شخص اپنی ہوا و ہوس کا مطیع ہو اور خدا کی طرف سے ہدایت بھی اس کی کوئی ہدایت نہ کرسکے اس سے بڑھکر کون شخص

۱۔ " قال اللہ تعالی ، من اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ " یہ مثال میں نے رہبر معظم آیۃ اللہ خامنہ ای مدظلہ سے سنی ہے۔

گمراہ ہو گا۔)

ہم کو اصول کافی میں ایک حدیث اس آیت کی مناسبت سے ملتی ہے کہ جو شخص بھی اپنے دین و مذہب کو کسی دوسرے شخص کے سلیقہ اور اپنی رائے سے حاصل کرے لیکن اپنے حقیقی امام کی اطاعت نہ کرے وہ اس آیت کا مستحق اور گمراہ ترین شخص ہے[۱]

دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص بہت زیادہ زحمتیں اٹھا کر عبادت کرے لیکن اس کا کوئی رہبر حق نہ ہو در حقیقت وہ گمراہ اور خدا اس کی عبادتوں اور اعمال کا دشمن ہے[۲]۔

مقدمہ امامت

اسلام کی نظر دنیا، مال، مقام، قدرت اور حکومت کے بارے میں ایک نظر وسیلہ ہے نہ کہ ہدف، لہذا اولیاء خدا کو جب بھی قدرت و طاقت حاصل ہوتی ہے اپنی سادہ زندگی سے ہاتھ نہیں اٹھاتے ہیں اور بڑا آدمی بننے تکبر و فخر فروشی اور فساد سرکشی کی فکر میں نہیں ہوتے ہیں قرآن میں ارشاد ہے" تلک الدار الاخرة نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض و لا فسادا " (قصص/آیہ ۸۳) ہم آخرت تو (اپنی بے پایاں نعمتوں کے ساتھ) تنہا ان لوگوں سے مخصوص کردیں گے۔ جو

۱۔ المیزان جلد / ۱۲ صفحہ / ۵۶

۲۔ اصول کافی جلد ۱/ صفحہ / ۳۷۵ کل من دان لله بعبادہ یجہد فیہا نفسہ ولا امام لہ من الله فسعیہ غیر مقبول وهو ضال متحیر و الله شانئ لاعمالہ "

روئے زمین پر تکبر اور سر کشی کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی فساد. جناب ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، امام اپنے جوتے کو سینے میں مشغول تھے، امام نے مجھ سے سوال کیا، اس پھٹے پرانے جوتے کی کیا قیمت ہوگی؟ میں نے کہا اس کی کوئی قیمت نہیں ہوگی.

امام نے فرمایا

"واللہ لھی احب من امریکم الا ان اقیم حقا او ادفع باطلا" (خطبہ ۳۳/ صبحی صالح/ ۴۸)

خدا کی قسم یہی پھٹا ہوا جوتا میرے نزدیک تم لوگوں پر حکومت کرنے سے بہتر ہے مگر یہ کہ حق برپا کروں اور باطل کو ختم.

ہاں امامت اور رہبری لوگوں کو شرک، ظلم، جہل اور تفرقہ سے نجات دینے کے لئے ہے نہ کہ اپنے فائدے اور مزے لوٹنے کے لئے.

اور قدرت و طاقت حاصل کرنے کے سلسلہ میں آئمہ معصومین ؑ کی کوشش بھی ہمیشہ خدا کے احکام اجراء کرنے کے لئے تھی. بناء براین اسلام میں امامت پوسٹ نہیں ہے بلکہ مسئولیت ہے. فائدے اور مزے لوٹنے کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک ذمہ داری ہے لہذا خود امام اپنی زندگی مکمل طور پر معمولی لباس اور سادے کھانوں پر بسر کرتے تھے، وقت ضرورت دوسروں کی طرح عدالت میں بھی حاضر ہوتے، کام کرتے اور کسی طرح کا فوق العادہ سازو سامان نہیں رکھتے تھے.

حضرت علی علیہ السلام ابن عباس کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اما بعد فلا یکن حظک فی ولایتک ما لاتستفیده و لاغیظاً تشتفیه و لکن اماته باطل واحیاء حق" (بحار جلد ۴۰ صفحہ / ۳۲۸) (جو حکومت تمہارے پاس ہے اس سے دولت جمع نہ کرو، تمہیں حق نہیں ہے کہ تم اپنی طاقت سے سوء استفادہ کرو اور کسی رقیب و مخالف کو غم و غصہ نہ دکھاو بلکہ تمہارا ہدف باطل کو نابود اور حق کو زندہ کرنا ہونا چاہیے۔

حضرت علی علیہ السلام جس وقت ایک شہر میں داخل ہوئے تو (اس کی حکومت کو خطاب کرتے ہوئے) فرمایا " دخلت بلا دکم با ثمالی هذه د حلتی فان انا خرجت بغیر ما دخلت فانی من الخائنین" (بحار جلد ۴۰ چاپ قدیم صفحہ / ۵۰۰) تمہارے شہر میں داخل ہوا ہوں اسی پھٹے پرانے لباس اور اسی (مختصر سے) سامان اور سواری کے ساتھ کچھ دیر کے بعد اگر تم نے دیکھا کہ میں اپنی اس موجودہ حالت کے علاوہ شہر سے نکلا ہوں تو سمجھ لینا کہ میں نے اموال میں کوئی خیانت کی ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں

"لولا حضور الحاضروقیام الحجة بوجود الناصر وما اخذالله علیٰ العلماء الا یقاروا علی کظة ظالم ولاسغب مظلوم لالقیت حبلها علی غاربها و لسقیت آخرها بکاس اولها ولالقیتم دنیاکم هذه ازهد عندی من عفطة عنز" (نج البلاغہ خطبہ سوم) (اگر میرے اطراف لوگوں کا اجتماع اور ان کو میری رہنمائی و رہبری کی ضرورت نہ ہوتی اور اگر یاور و دوست پیدا ہونے کی وجہ سے حجتیں مجھ پر تمام نہ ہوئیں، اور لوگوں کے اس اجتماع اور حمایت نے میری ذمہ داریوں کو

سنگین نہ کیا ہوتا اور اگر خداوندعالم نے علماء سے عہد و پیمان نہ لیا ہوتا کہ وہ مظلوموں کی بھوک اور ظالموں کی پرخوری پر آرام سے نہیں بیٹھیں گے تو میں حکومت کی رسی اور لگام کو اس کی کوہان پر ڈال دیتا۔ اور تم دیکھو گے کہ یہ تمہاری دنیا اپنے مال و متاع، مقام اور حکومت کے ساتھ میرے نزدیک اس پانی سے بھی کم اہمیت ہے کہ جو چھینکتے وقت ایک بزغالہ کی ناک سے نکل پڑتا ہے)۔

حضرت علی علیہ السلام خطبہ ۲۱۴ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ خداوند متعالی نے ہم لوگوں میں سے ہر ایک کی گردن پر کچھ متقابل حقوق قرار دیئے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ تنہا حاکم ہی امرو نہی کا حق رکھتا ہو اور وہ اپنی کامیابی اور مقام سے فرماندھی کی لذت اٹھاتا ہو۔ اب جب کہ ہم نے جان لیا ہے کہ حکومت کا ہدف مزے لوٹنا اور فائدے اٹھانا نہیں ہے ورنہ حضرت علی علیہ السلام اپنی روز مرہ کی زندگی کے لئے اپنی شمشیر فروخت کرنے پر مجبور نہ ہوتے اور وہ بھی اپنے دور حکومت میں۔ کیونکہ فرماتے ہیں "واللہ لو کان عندی ثمن ازار مابعتہ" (بحار/ج ۴۰ رصفحہ ۳۲۴) خدا کی قسم اگر میرے پاس معمولی اور چھوٹے سے لباس کے لئے بھی پیسے ہوتے تو میں کبھی اپنی تلوار نہ بیچتا یا جیسے حضرت امام رضا علیہ السلام جس وقت ولایتعہدی کے عہدہ پر فائز تھے تو چٹائی پر بیٹھتے اور زندگی گزارتے تھے اور غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے حضرت سلیمانؑ اپنی عظمت و وقار کے باوجود غریبوں اور مستضعفین کے پاس بیٹھتے اور ان کے ساتھ مہرو محبت سے پیش آتے تھے (ایضا)۔

امام کی نشانیاں

علامتیں

جب کہ مسئلہ امامت و رہبری اور امت کی ہدایت ، زندگی کے اساسی ترین مسائل میں سے ہے . اور احتمال ہے کہ کسی بھی وقت امت حیلوں اور یہاں اور وہاں کی تبلیغات کی جال میں نہ پھنس جائے لہذا قرآن نے بھی اور حضرت رسول اکرمؐ نے بھی کچھ ایسی علامتیں بتا دی ہیں جو کنویں میں پڑے انسان کے لئے راہیں روشن کرسکتی ہیں چونکہ ہم نے سادہ گوئی کا عہد کیا ہے لہذا ان علامتوں کو خلاصہ کے ساتھ یہاں نقل کرتے ہیں ،

الف ۔ مسجد نبویؐ میں ایک فقیر وارد ہوا اور لوگوں سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا لیکن کسی نے اس کو کچھ نہ دیا فقیر نے کہا خدایا تو گواہ رہنا . مجھے لوگوں نے محروم کیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے جو اس وقت رکوع میں تھے فقیر کو اشارہ کیا جیسے ہی وہ قریب آیا حضرتؑ نے اپنی انگوٹھی اس کو عطا کر دی اس وقت سورہ مائدہ کی ۵۵ ویں آیت نازل ہوئی۔

کہ تنہا تمہارا ولی خدا ، رسولؐ اور وہ شخص ہے کہ جس نے حالت رکوع میں اپنی انگوٹھی فقیر کو دی ہے یہ ایک واضح اور روشن دلیل ہے جس کے بعد لوگوں نے تحقیق کی تو سب سمجھ گئے کہ وہ شخص حضرت علی علیہ السلام ہیں، البتہ علیؑ کا مقام پہلے سے تمام کے نزدیک روشن تھا لیکن انگوٹھی کا عطا کرنا ایک دلیل نشانی اور اس مقام کی معرفی کی خاطر تھا کہ حضرتؑ کو خدا اور رسولؐ کے ساتھ ساتھ امت کی سرپرستی کا حق حاصل ہے ورنہ حالت رکوع میں انگوٹھی عطا کرنا تنہا مقام امامت کو ثابت نہیں کر سکتا ہے لیکن ہاں لوگوں کیلئے ایک اچھی علامت ہو سکتا ہے .

مثال

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی شخص کو اپنے گھر بھیجتے ہیں کہ وہ جائے اور آپ کی بیوی سے فلاں انبار یا الماری کی چابی لیکر اس میں سے فلاں چیز آپ کے پاس لے آئے ، یقیناً بیوی کے اطمینان کے لئے آپ اس کو کوئی علامت بھی بتائیں گے کہ ہماری بیوی سے کہنا کہ رات ہم نے طے کیا تھا کہ ایک مبلغ سے ہم فلاں شخص کی مدد کریں گے .

توجہ کریں کہ مبلغ نمک سرمائے اور انبار کے سامان سے قابل مقائسہ نہیں ہے لیکن آپ کی بیوی کے لئے یہ پیغام ایک علامت اور پہچان کی حیثت رکھتا ہے تاکہ وہ انبار کی کنجی آپ کی تحویل میں دے دے ..

انگوٹھی کی داستان بھی بالکل اسی طرح ہے کہ یہ حضرتؑ کا عمل ایک نشانی سے زیادہ نہیں ہے ورنہ انگوٹھی کا دینا اس مقام الٰہی کو نہیں پہنچا سکتا ہے مقام

امامت حضرت علیؑ کے لئے پہلے سے الٰہی معیاروں کے ذریعہ ثابت ہے لیکن تمام لوگوں کو بتانے کے لئے یہ عمل انجام پایا۔

ب۔ حضرت رسول اکرمؐ ۲۳ سال درجہ رسالت پر فائز تھے اور ایک سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں تو مجموعاً آنحضرتؐ کی رسالت کے ایام ۸۳۹۵ ہوتے ہیں۔ ایک آیت نازل ہوئی

۱۔ آج تمام کفار تمہارے دین سے مایوس ہوگئے "الیوم یئس الذین کفروا من دینکم"

۲۔ آج تمہارا دین مکمل ہوگیا "الیوم اکملت لکم دینکم"

۳۔ آج میں نے اپنی نعمتیں تم پر تمام کردی ہیں۔ "واتممت علیکم نعمتی"

۴۔ آج میں نے مکتب اسلام کو تمہارے لئے ایک دین کے عنوان سے قبول کرلیا ہے "ورضیت لکم الاسلام دینا"

آپ چند ہزار روز جن میں رسولؐ درجہ رسالت پر فائز تھے تلاش کریں اور دیکھیں کہ کوئی ایک دن مذکورہ اوصاف سے مطابقت رکھتا ہے۔ جو چیز مسلم ہے وہ یہ کہ یہ دن عادی نہیں ہے بلکہ یہ روز بہت ہی حساس اور مہم ہے اب ہم ایام بعثت کے حساس دنوں کے نام لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مذکورہ آیت کس دن سے مطابقت رکھتی ہے۔

۱۔ آیا روز اول بعثت ہے؟ ہرگز نہیں اس لئے کہ روز اول دین کامل ہوا تھا اور نہ ہی کفار مایوس ہوتے تھے....

۲۔ کیا اعلان تبلیغ کا وہ دن ہے جب رسولؐ تین سال مخفیانہ فعالیت کے بعد حکم خدا ہوا کہ اپنی دعوت تبلیغ کو آشکار کریں؟ ہرگز نہیں اس لئے کہ وہ دن بھی کام کا پہلا روز ہے اور ابھی کوئی کام انجام نہیں پایا ہے۔

۳۔ کیا روز ہجرت، روز تولد فاطمہ زہراؑ یا جنگ بدر میں کامیابی کا روز ہے؟ ہرگز نہیں اس لئے کہ ہجرت، تولد فاطمہؑ اور فتح بدر کے کئی سال بعد تک رسولؐ کی زندگی میں آیتیں نازل ہوتی رہی ہیں اور نہیں ہوسکتا ہے کہ ہم ان دنوں کو کمال دین کا روز مان لیں۔

۴۔ کیا جس دن خدا نے چار صفتیں بیاں کی ہیں روز فتح مکہ ۸ھ یا مشرکین مکہ کے زائروں کا روز تصفیہ ۹ھ ہو سکتا ہے؟ ہرگزہ کیونکہ فتح مکہ میں تنہا مکہ کے کفار مایوس ہوئے ہیں نہ سارے جہان کے، دوسرے ۸ھ سے لیکر ۱۰ھ تک کہ جو رحلت رسولؐ کا سال ہے دسیوں احکام اور آیتیں نازل ہوئی ہیں لہذا ۸ھ کو کمال دین اور تمام نعمت کا سال تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ کیا ممکن ہے کہ وہ دن، عرفہ کا دن ہو جب رسولؐ لوگوں کے ساتھ مراسم حج کے انجام دینے میں مشغول تھے؟ ہرگز، نہیں اس لئے کہ مراسم حج رسولؐ کے لئے دین کا ایک جزء ہے نہ کہ تمام دین، جب کہ قرآن فرماتا ہے کہ آج تمہارا دین کامل ہو گیا خلاصہ یہ کہ ہمیں غور و فکر کرنا چاہیئے تا کہ معلوم ہو کہ وہ کونسا دن ہے تمام دنوں کی تحقیق کے بعد ہم روز غدیر خم تک پہونچیں گے، جو عید قربان سے آٹھواں (۱۸ ذی الحجہ کا) روز ہے۔

آنحضرتؐ کی عمر مبارک کا آخری سال تھا رسولؐ نے لوگوں کے ساتھ اعمال حج انجام دیئے اور واپسی پر ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سے تمام لوگ ایک دوسرے سے جدا اور اپنے اپنے گھروں اور سر زمین (یمن ، مدینہ ، عراق ، اور حبشہ وغیرہ) کی طرف جائیں گے اتنے میں حضرت علیؑ کو منصوب کرنے کا حکم آیا حضرت رسول اکرمؐ نے خاص اہتمام کے ساتھ رہبری امت کے لئے خدا کی طرف سے حضرت علیؑ کو نصب کر دیا اور مذکورہ آیت نازل ہوئی کہ :

۱ ۔ آج کفار مایوس ہو گئے اسلئے کہ کفار کی (شاعر ، ساحر اور مجنون) جیسی تہمتوں نے بھی کچھ نہ کیا اور خیبر و خندق وغیرہ کی جنگیں بھی اسلام کے حق میں تمام ہوئیں ، سازشیں ناکام ہوئیں . کفار کو صرف ایک امید تھی اور وہ رسول اسلامؐ کی موت تھی ، اس لئے کہ حساب لگائے بیٹھے تھے کہ رسولؐ بوڑھے ہو گئے ہیں ، کوئی لڑکا بھی نہیں ہے اور کسی کو اپنا جانشین بھی نہیں بنایا ہے لہذا ان کی موت پر ضرور شور و غل ہو گا . لیکن جیسے ہی انھوں نے دیکھا کہ علیؑ نام کا ایک شخص جو سب سے بہتر ہے ، غدیر کے دن منصوب ہو گیا ہے تو ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا ، اور اس دن صحیح معنوں میں کافر مایوس ہو گئے .

۲ ۔ اس روز دین بھی کامل ہوا اس لئے کہ قانون کے ساتھ ساتھ حاکم آگیا مجری قانون منصوب ہو گیا (انسانی) نمونہ کی شناخت ہو گئی اور کشتی اسلام کا ناخدا منتخب ہو گیا "اکملت لکم دینکم" رہبر کے بغیر دین ایسے ہے جیسے ڈاکٹر کے بغیر دوا .

۳ ۔ آج مسلمانوں پر الٰہی نعمتیں بھی تمام ہو گئیں اور سچ یہ ہے کہ اگر

تمام نعمتیں ہوں لیکن رہبری کی نعمت نہ ہو تو سب بے کار ہیں۔

۴۔ آج جب کہ تم لوگ صاحب قانون اور حاکم ہو گئے ہو اسلام اپنے تمام ابعاد کے ساتھ کامل ہو گیا، میں تمہارے لئے ایسے مکتب کو قبول کرتا ہوں اور تمہارے لئے ایسے آئین سے راضی ہوں۔

اگرچہ بحث طویل ہو گئی ہے لیکن مفید تھی اس لئے کہ ہمارا موضوع امام کی روزانہ اور اس کی پہچان کے طریقہ کو بتانا ہے اور ہم نے دیکھا کہ قرآن اپنے بیان کی شیرینی کے ذریعہ اس دن کے اوصاف کا تذکرہ کیسے کرتا ہے جو تمام عمر بعثت کے صرف ایک دن میں منحصر ہے اور یہ تمام اوصاف اسی قرآن کے متن میں موجود ہیں کہ جسے مسلمان روزانہ پڑھتا ہے۔[1] چونکہ ہم نے خلاصہ نویسی کا ارادہ کیا ہے لہذا یہاں ہم گفتگو ختم کرتے ہیں اور چلتے ہیں اس طرف کہ رسول اکرمؐ نے اس سلسلہ میں کیا فرمایا ہے، اور آنحضرتؐ نے مقام رہبری کو پہچنوانے کے لئے کیا کیا کوششیں کی ہیں۔

۱۔ سوال۔ اگر مذکورہ آیت روز غدیر اور معرفی امام سے مربوط ہے تو کیوں ماقبل اور مابعد کی آیتیں اور جملے غذاؤں سے مربوط ہیں؟

جواب۔ قرآن محفوظ ہونا چاہیے اور خدا نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور قرآن کو محفوظ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ۱۔ ایک قدرت غیبی اور الٰہی کے ذریعہ۔ ۲۔ دوسرے راہ اور جگہ گم کرنے کے ذریعہ۔ اکثر اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ سونے کو روئی کی تھیلی یا دیواروں میں چھپاتے ہیں تاکہ چوروں اور برا چاہنے والوں سے محفوظ اور گم ہو جائے مسئلہ غدیر بھی مسئلہ تحریم یعنی سور اور مردہ جانوروں وغیرہ کے گوشت کے ضمن میں بیان ہوا ہے تاکہ محفوظ رہے۔

اقوال رسول اسلامؐ

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی گفتگو میں بارہا اول بعثت سے ہی معصوم رہبری کو بیان کیا ہے۔ آپؐ کی تبلیغ کے پہلے ہی دن یہ آیت نازل ہوئی " وانذر عشیرتک الاقربین " (شعراء / ۲) خدا نے حکم دیا کہ اے رسولؐ اپنی تبلیغ کے ذریعہ اپنے عزیز و اقرباء کو ڈراو۔ رسولؐ نے ایک جلسہ کا پروگرام رکھا اور اپنے تمام اقرباء کو دعوت دی۔ جب سب اکٹھا ہو گئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا۔ جو شخص مجھ پر ایمان لائے گا وہ میرا خلیفہ اور جانشین ہو گا۔

(تفسیر برھان جلد / ۳ صفحہ ۱۹۱)۔......... (تاریخ طبری جلد ۲)

پیغمبر اکرمؐ نے بارہا اور برابر حضرت علیؑ کے بارے میں گفتگو کی تھی اور جنگ تبوک کے موقع پر ان کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اکثر آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ یا علیؑ! تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے کہ جو ہارون کو جناب موسیٰؑ سے تھی ۔(صحیح بخاری۔ تفسیر نمونہ جلد ۷ صفحہ ۳۴۳ پر اس سلسلہ میں مفصل بحث ہوئی ہے)

اپنے بعد کے لئے لوگوں کی توجہ اور رہنمائی جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کی طرف کی اور فرمایا۔ فاطمہؑ کی تائید اس شخص کی حقانیت کی دلیل ہے۔

اور کبھی جناب ابوذر کو ملاک قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ زبان کا سچا ہے لہذا اس کا بیان حق ہے یعنی اے لوگو! دیکھو کہ ابوذر رہبری کے مسئلہ میں کس کی طرفداری کرتے ہیں۔

کبھی جناب عمار سے فرمایا ، اے عمار تمہارے قاتلین ظالم اور باطل لوگ ہونگے گویا اس بیان سے آنحضرتؐ نے معاویہؓ (اور اس) کی فوج پر ایک محکم ضرب لگائی ہے کیونکہ جیسے ہی جناب عمار جنگ صفین میں معاویہ کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے فوراً لوگوں کو رسولؐ کی حدیث یاد آگئی کہ عمار کے قاتلین ظالم اور ستمگر ہیں وہ آپس میں کہنے لگے معاویہ کی جنگ باطل پر ہے نبابراین انھوں نے میدان چھوڑنا شروع کردیا۔ معاویہ کو جیسے ہی خبر ہوئی تو اس نے عمرو عاص کے مشورے سے خاص زرنگی اور چالاکی دکھائی اور عمار کے بارے میں جو رسولؐ کی حدیث تھی اس کی توجیہ کی اور بھپرے ہوئے مجمع پر کنٹرول کیا۔

اور کبھی رسولؐ دلچسپ تشبیہوں کے ذریعہ لوگوں کو معصوم رہبری کی طرف متوجہ کرتے اور فرماتے ، " مثل اهل بیتی کمثل سفینه نوح من رکبها نجی "(الغدیر جلد ۲ صفحہ ۳۰۱) میرے اہلبیتؑ کی مثل جناب نوحؑ کی کشتی جیسی ہے جو مومنین اس میں سوار ہو گئے نجات پاگئے اور جو کافر ایمان نہیں لائے اور سوار نہیں ہوئے غرق ہوگئے۔

اور کبھی فضائل بیان کر کے پہچنوایا مثلاً جیسے یہ جملہ " انا مدینه العلم و علی بابها " کہ میں شہر علم ہوں اور علی ابن ابی طالبؑ اس کا دروازہ ہیں۔ اس طرح گویا آپؐ نے علمی شخصیت اور امام معصوم کی طرف رجوع ، کو لوگوں کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔

حتیٰ رحلت کے وقت بھی اپنی کوششوں میں کوتاہی نہیں کی اور فرمایا ، قلم

اور کاغذ لے آو تا کہ میں تمہارے لئے ایک نوشتہ لکھوں، لیکن افسوس آپؐ کو ایک ایسا جواب دیا گیا کہ جو ادب سے ساز گار ہے اور نہ شرع سے اور نہ ہی قرآن سے ہے اس لئے کہ جو لوگ اپنے کو مقام خلافت کا مستحق سمجھ رہے تھے وہی لوگ آگے آئے اور رسولؐ کی تحریر وجود میں نہ آنے دی۔

اور کہنے لگے "ان الرجل لیھجر" رسول (معاذاللہ) کسالت اور بیماری کی وجہ سے حزیان اور بیہودہ گفتگو کررہے ہیں۔ کاش کہنے والے کو معلوم ہوتا کہ خدا اپنے رسولؐ کے بارے میں فرماتا ہے "ومایںطق عن الھوی ان ھوالا وحی یوحی" وہ ہرگز ہوا (وہوس) سے گفتگو نہیں کرتا ہے اس کی تمام باتیں وحی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی ہیں۔

چھوڑیں ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ رسولؐ نے امت کی رہبری کے لئے بہت زیادہ کوششیں کی ہیں دعوت کے پہلے روز ہی فرمایا کہ جو سب سے پہلے مجھ پر ایمان لائے گا وہ خلیفہ اور امام ہے، اپنی عمر مبارک کے آخری دن بھی فرمایا کہ قلم اور کاغذ لے آو اور روز غدیر خم بھی فرمایا، من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ۔"

علامتوں اور بزرگ شخصیتوں مثلاً جناب فاطمہ زہراؑ، ابوذر اور عمار کی تائیدوں کے ذریعہ بھی پہچنوایا کہ جس کو یہ میرے اصحاب قبول کریں وہی امام ہو گا۔ جی ہاں کسی طریقہ سے بھی کمی نہیں چھوڑی ہے اپنی آخری کوشیش کرڈالی ہیں۔ لیکن رسول خداؐ کے حکم کا اجراء نہیں ہوا ہے۔ خدا ان لوگوں کو برترین سزائیں دے جنہوں نے روز اول سے ہی امت کی رہبری کے سلسلہ میں ظلم کیا ہے اور

خدا نا بود کرے ان لوگوں کو جو آج بھی امت کے رہبر معظم اور ان معصوم بزرگواروں کے نائب بر حق کے مقام کی تضعیف کرنے پر تلے ہوئے ہیں.

کیوں رسولؐ کی تمام محنتیں بے کار گئیں

ان تمام سفارشوں، تائیدوں، لیاقتوں اور فضائل و نصب کے باوجود جو حضرت علی علیہ السلام کے یہاں پائے جاتے تھے لوگوں نے ان کو کیوں ایک عرصہ تک چھوڑے رکھا.

جواب

حکم خدا کو پیروں میں کچلنے کا مسئلہ تازہ نہیں ہے قرآن کی کتنی آیتوں نے ہم کو تقویٰ و امانت کی دعوت دی ہے پس کیوں تقویٰ کم ہے. کیا ابلیس نے جناب آدمؑ کو سجدہ کیا؟ کیا جناب موسیٰؑ کی امت خود ان کے زمانے میں منحرف نہیں ہوگئی صرف اس لئے کہ چند روز جناب موسیٰؑ کو نہیں دیکھ پائی تھی؟

بنابر این فراموشی، نسیان اور بے اعتنائی بر تنا انسان کی خاصیتوں میں سے ہے تنہا وہ لوگ کہ جنھوں نے اپنے آپ کو بنایا ہے اور خدا کا خاص لطف و کرم ان کے شامل حال ہے وہ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں.

دوسرے دیرینہ حسد اور کینہ جو لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کی ذات سے تھا باعث بنا کہ وہ آپؑ کو قبول نہ کریں، کیونکہ آپؑ نے بدر واحد اور خیبر و حنین جیسی جنگوں میں جن لوگوں کو قتل کیا تھا وہ کسی نہ کسی کے عزیز اور رشتہ

دار ہوتے تھے . لوگ ہرگز حاضر نہیں تھے کہ وہ اپنے باپ، بیٹے یا چچا کے قاتل کو بطور امام تسلیم کریں اس کے علاوہ دوسری جو وجوہات باعث بنی ہیں مسئلہ عدالت اور امام کا وقت عمل تھا ، یہ مسئلہ ناکثین اور ان لوگوں کے یہاں دیکھنے میں زیادہ آتا ہے کہ جنھوں نے قتل عثمان کے بعد حضرت علیؑ کے ہاتھوں پر بیعت تو کی لیکن کچھ دنوں کے بعد بیعت سے پھر گئے اور جنگ جمل میں شریک ہوئے .

اس لئے کہ یہ لوگ امام سے اپنے حق سے زیادہ مال اور اہم مقام کے خواہاں تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا ، امام کسی پر خاص توجہ نہیں کر رہے ہیں ، حتی سر کردہ اور خود غرض لوگوں نے ہر چند امام کو پیشنہادیں بھی کیں کہ وہ ہم سے اہم امور میں مشورہ کیا کریں .

لیکن حضرت فرماتے کہ جہاں میں خدا کی رضا اور حکم نہ جانتا ہو گا وہاں سب سے مشورہ کرلوں گا کہ اور تم بھی اس میں شریک ہو گے (لیکن جہاں خدا کی رضا مجھے معلوم ہوگی وہاں اس پر عمل کروں گا) وہ لوگ بہت زیادہ مدد کا تقاضا رکھتے تھے لیکن چونکہ امام محروم اور غریبوں کے مال میں دقیق نظر اور لوگوں کے بقول منھو کا نوالہ بھی چھین لیتے تھے لہذا کبھی بھی حاضر نہیں تھے کہ وہ لوگوں کی غیر منصفانہ مانگ پوری کریں .

جی ہاں امام کی دقیق نظر اور عدالت بھی آپؑ کو نادیدہ سمجھ لینے کے اسباب میں سے ایک ہے جو امام تاراج شدہ اموال کو واپس دلا رہا ہو وہ ضرور اپنے لئے

دوسروں کی مخالفت مول لے گا۔ لوگ ضرور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونگے خلاصہ یہ کہ لوگوں نے رسولؐ کی سفارش اور تاکید پر عمل نہیں کیا۔ نصب الہیٰ کو نا دیدہ اور رہبری کے راستہ کو ایک دم بدل ڈالا لہذا وہ بارگاہ الہیٰ میں خدا کے فیصلے کے منتظر رہیں کہ وہ قرآن کی ان جیسی آیتوں کے مستحق ہیں جہاں ارشاد ہوتا ہے :

" والذین یو ذون رسول اللہ لھم عذاب الیم " (توبہ/آیۃ ۶۱)

(جو لوگ رسول خدا کو اذیت کرتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے)

اور کونسی اذیت آنحضرتؐ کی وصیتوں پر بے اعتنائی سے بڑھکر ہو سکتی ہے

احقاق حق

قرآن اور حضرت رسول اکرمؐ کے کہنے کے علاوہ خود امام نے بھی متعدد جگہوں پر اپنی حقانیت ، لیاقت اور کمالات کے بارے میں اعلان کیا ہے مثلاً نہج البلاغہ میں حضرت اس شخص کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں جس نے آپؑ پر اعتراض کیا کہ کسی قدر آپ حکومت کے بارے میں حریص ہیں فرمایا ، " انما طلبت حقالی " (نہج البلاغہ ، فیض الاسلام صفحہ / ۵۲۵) میں اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہوں کہ جو میرا ہے ۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔ " اری تراثی نھبا " (نہج البلاغہ /خطبہ ۳) میں اپنی میراث تاراج ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں ۔ اور دوسری جگہ فرمایا : " ان محل منھا محل القطب من الرحی " (نہج البلاغہ خطبہ / ۳) (خلافت و حکومت میں میرا مقام ایسے ہے جیسے چکی کے دونوں پاٹ کے درمیان کیل کی ہو)۔

صفات امامؑ

میں نہیں جانتا ہوں کہ اس سلسلہ میں کیا لکھوں اور کونسی راہ اختیا کروں میں روایات میں اوصاف امام کو دیکھ کر متحیر ہوں .دوسرے بہت سے ایسے عزیز قارئین بھی ہیں جو تفصیل سے پڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ہیں .لیکن سبھی چاہتے ہیں کہ امام کے کچھ صفات سے آشنا ہو جائیں لہذا ہم بھی اسی مقدار پر اکتفا کرتے ہیں .

عصمت

معصوم یعنی جو گناہ نہ کرے بلکہ گناہ کا تصور تک بھی نہ کرے . خود ہم بہت سے گناہوں کی نسبت معصوم ہیں یعنی آج تک ہم ان کے مرتکب ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کی فکر کی ہے . مثلاً جیسے یہ گناہ کہ کوچہ بازار میں ننگا ہو کر جانا ، خود کشی کا گناہ قتل نفس کا گناہ اور فاسد و مسموم شدہ غذاوں کے استعمال کا گناہ وغیرہ وغیرہ . جیسا کہ ہم اپنے علم و آگاہی کے سبب بہت سے گناہوں کو انجام دینے کی فکر میں نہیں ہوتے ہیں اسی طرح امام کو تمام گناہوں کی نسبت جو علم و یقین حاصل ہے اس کے سبب وہ یہی حالت رکھتے ہیں کہ کسی گناہ کے قریب نہیں جاتے ہیں .

کشادہ دلی

امام کو کشادہ سینہ رکھنا چاہیے " الۃالریاسۃ سعۃ الصدر " روح بزرگ (اور وسیع قلبی) ریاست کا وسیلہ ہے ، زود رنجی ،عجلت اور کم حوصلگی ادارہ اور ہدایت معاشرہ کو ساز گار نہیں ہے .

جیسے ہی خدانے جناب موسیٰؑ کولوگوں کی ہدایت کیلئے چنا تو انھوں نے خدا سے چند چیزیں طلب کیں کہ ان میں سب سے پہلی چیز سینہ کی کشادگی اور ظرف کا وسیع رکھنا تھا کہا : " رب اشرح لی صدری "سورہ طہ آیہ ۲۵ (خدایا ! تو مجھے سینہ کی کشادہ دلی اورایک بلندروح عطا کرنا کہ میں تمام حوادث کےمقابل بردبارا ہوں)

رسول خداؐ سے فتح مکہ کے روز جب مسلمانوں نے چاہا کہ مشرکین سے شکنجوں کا انتقام لیں توآپؐ نے ان کواجازت نہیں دی اور فرمایا آج کا دن رحمت کا دن ہے نہ کہ انتقام کا،اور امام حسن علیہ السلام کا جب کسی مرد شامی سے سامنا ہوا اور اس نےآپ کو نازیبا الفاظ میں برا بھلا کہا توآپ نے اس سے فرمایا : کیوں ناراض ہو پیسے کی ضرورت ہو تو پیسہ دوں ، گھر نہ ہو تو گھر کا انتظام کروں اور اس قدراس کےساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے کہ وہ شامی شرمندہ ہوگیا اور کہا : خدا بہتر جانتا ہے کہ کس شخص کو رہبر بنائے تاریخ میں اس طرح کے واقعات ہمارے تمام اماموں کے بارے میں دیکھنے کو ملتے ہیں اگر (خدانے) توفیق دی تو مختصر طور پر ایک مسودہ اماموں کی زندگی اور سیرت کے بارے میں لکھوں گا .

عدالت

جہاں تمام لوگوں کو عدالت پسند ہونا چاہیے وہاں امام کو تو اس کا ایک نمایاں نمونہ ہونا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ پھر حضرت علیؑ کی زندگی کی طرف چلیں اور عدالت کو ان سے سیکھیں۔ ہم نے تیسرے جزوہ میں عدالت اجتماعی کے عنوان کے تحت حضرت علیؑ کی عدالت سے متعلق بہت اہم باتیں لکھیں ہیں۔ یہاں بطور نمونہ ایک دو ارشادات پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے اپنے گورنروں میں سے کسی ایک کو اپنے کسی خط میں اس طرح تنبیہ کی اگر میں نے سن لیا کہ تم نے بیت المال میں خیانت کی ہے تو خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ نہایت سختی سے پیش آوں گا (۱)

۲۔ مالک اشتر کو عہد نامہ کے ضمن میں اس طرح حکم دیتے ہیں کہ ملک کے دور ترین علاقوں کا اسی طرح حصہ ہونا چاہیے جس طرح مرکز حکومت سے نزدیک ترین علاقوں کا ہے (۲)

۳۔ اپنے قاتل ابن ملجم کے بارے میں فرمایا، میری شہادت کے بعد سوائے اس کے کسی دوسرے کو اذیت نہ پہونچے "لا تقتلن الا قاتلی" (۳)
یہاں تک کہ فرمایا، جیسا اس نے مجھے ایک ضربت لگائی ہے تم بھی اس کو ایک ہی ضربت لگانا اور خیال رکھنا کہ قدم عدالت کی حد سے اس پار نہ جاپڑے۔

۱۔ نہج البلاغہ نامہ / ۲۰ صبحی صالح ۳۷۷ ۲۔ نہج البلاغہ / خط مالک اشتر کے نام " فان للا قصی منھم مثل الذی للا دنی"
۳۔ نہج البلاغہ / خط ۴۷ کہ جو وصیتنامہ کی شکل میں ہے فیض الاسلام ۹۷۸ (سوائے میرے قاتل کے کسی کو قتل نہ کرنا)

جو حد جناب قنبر کے ہاتھوں جاری ہوئی اس میں جناب قنبر نے تین کوڑے زیادہ لگادیئے تو امامؑ نے واپس تین کوڑے جناب قنبر کو لگائے اور کبھی امامؑ نے روابط، سابقہ، محبت، خدمت اور تعلقات کو جو اکثر لوگوں کے یہاں پائے جاتے ہیں ان کی رعایت نہیں کی۔ (قصار الجمل جلد ۲ صفحہ ۲۱)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، اگر مجھے ساتوں ممالک اور حکومتیں بخش دی جائیں کہ میں کسی چیونٹی پر ظلم یا اس کے منہ سے جو کا چھلکا چھین لوں تو یہ کام میں نہیں کر سکتا ہوں۔

ایک دوسرے واقعہ میں امام نے سنا کہ کسی غیر مسلمان عورت کی زینت اور زیور چھین لیا گیا ہے گویا اس طرح اس پر ظلم ہوا ہے اور کسی نے اس پر کوئی رد عمل نہیں لیا ہے تو اس قدر ملول ہوئے کہ فرمایا، اگر مسلمان اس حادثہ سے مرجائے تو اس کی جگہ یہ ہے۔ (قصار الجمل جلد ۲ صفحہ ۲۱)

میں پھر یاد دہانی کررہا ہوں کہ یہ کتابچہ شناخت امام کے سلسلہ میں پہلا اقدام ہے لہذا اگر ہم کسی صفت اور کمال کی طرف اشارہ کرکے یا فہرست وار گذر رہے ہیں کیونکہ ہمارا مقصد سادہ نویسی اور بحث امامت میں ایک سیر کرنا ہے نہ کہ مسئلہ امامت کی تحقیق۔

امام اپنی ہوا و ہوس پر قابو رکھتا ہو

حضرت علی علیہ السلام ۴۵ ویں نامہ کے ضمن میں فرماتے ہیں "هيهات ان يغلبني هواي" کتنا دور ہے کہ میرے ہوا و ہوس مجھ پر غالب آئیں اور مجھے عدالت

و حق کی مسیر سے دور کریں.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے جد حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ شرائط امامت میں بہت سی چیزیں ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ "لایلهوه شی من امر الدنیا" مسائل مادی اسے سرگرم نہ کریں (بحار جلد ۲۵/ص ۱۶۴) شجاع ہو حضرت علیؑ فرماتے ہیں "وما اهدد بالحرب" ابھی تک جنگ نے مجھے نہیں ڈرایا ہے اور میری لوح میں اس نے اثر نہیں کیا ہے۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۰)

امام جعفر صادقؑ حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں، امام کو چاہیے کہ وہ لوگوں میں شجاع ترین مرد ہو (بحار ۲۵ صفحہ ۱۶۵) ایک دوسری حدیث میں ہمیں ملتا ہے: امام کو ڈرپوک اور بزدل نہیں ہونا چاہیے (بحار جلد ۲۵ صفحہ ۱۶۷) موت اور شہادت کا مسئلہ امام کے لئے حل ہونا چاہیے اور حضرت علیؑ فرماتے ہیں: (خدا کی قسم میں موت سے اس طرح مانوس ہوں جتنا بچہ اپنی ماں کے دودھ سے مانوس نہیں ہوتا

(نہج البلاغہ خطبہ ۵ صفحہ ۵۷ / فیض الاسلام)

امام صاحب فضیلت ہو

حضرت علیؑ معاویہ کے نام نہج البلاغہ کے دسویں خط میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں: " متی کنتم یا معاویة ساسة الرعیة و ولاة امر الامة بغیر قدم سابق ولا شرف باسق " (اے معاویہ) تمہیں لوگوں کی سیاست اور حکومت سے کیا کام ہے؟ تمہارا ماضی اچھا ہے نہ ہی تمہیں کوئی شرف حاصل ہے، اور نہ ہی کوئی فضیلت و بلندی حاصل ہے۔ جی ہاں امام کو چاہیے کہ وہ اپنے ماضی پر ذرہ برابر بھی کائی دھبہ نہ رکھتا ہو۔

امام کے دوسرے صفات

قرآن کے مطابق حکم کرے

"فلعمری ماالامام الا الحاکم بالکتاب "حضرت علیؑ فرماتے ہیں :(اپنی جان کی قسم کوئی لوگوں کاامام نہیں ہے مگروہ شخص جوخدا کی کتاب کےمطابق حکم کرے (ارشاد مفید) امام کو چاہیے کہ وہ دین حق کامقصد ہواور اپنے ہوا و ہوس کےمقابل خود کوکنٹرول میں رکھے "الدائن ندین الحق الحابس نفسه علی ذات الله "(ارشاد مفید)

امام مہربان ترین شخص ہو

حضرت امام رضاؑ صفات امام کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں " اشفق علیھم من آبائھم وامھاتھم " (بحار جلد ۲۵ صفحہ ۱۱۷) (امام) ماں باپ سے زیادہ لوگوں پر مہربان ہوتا ہے

دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔ " عالم با لسیاسۃ " (بحار جلد ۲۵/ص۔ ۱۶۹ و ۱۶۷) یعنی امام کو چاہیے کہ وہ سیاست کا عالم ہو اپنی اچھی اچھی تدبیروں کے ذریعہ معاشرہ کو ترقی اور

ارادہ کر سکتا ہو۔ " قائم بالامر باسۃ " (بحار جلد ۲۵ صفحہ ۱۶۵) یعنی امام کو چاہیے کہ وہ خدا کی عظیم ذمہ داریوں کو نبھا سکتا ہو۔

امام کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی ضرورت کی تمام زبانوں میں بول سکتا ہو " یکلم الناس بکل لسان ولغۃ" لوگوں کے ساتھ ہر لغت اور زبان میں گفتگو کرتا ہو (بحار جلد ۲۵ صفحہ ۱۴۱)

زہد و تقویٰ

صفات امام میں سے ایک دنیا سے بے رخی اور اس کا تقوی و زہد ہے۔ حضرت علیؑ اپنے پیوند لگے لباس کے بارے میں فرماتے ہیں " واللہ لقد رقعت مدرعی ھذہ حتی استحییت من راقعھا " (خدا کی قسم میں اپنے اس لباس میں اتنا پیوند لگا چکا ہوں کہ اب مجھے کسی درزی کے پاس اس کو لے جاتے ہوئے شرم آتی ہے (نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۹)

دوسری جگہ فرماتے ہیں: " واللہ ماکانت لی فی الخلافۃ رغبۃ " (خدا کی قسم مجھے خلافت کے بارے میں کوئی رغبت اور لالچ نہیں ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۱ صفحہ ۳۳۷، صبحی صالح، ۳۲۵)

ہم زہد، سادگی اور غریبوں کے ساتھ ہمنشینی کے بارے میں خود حضرت علیؑ کی زبان سے اس طرح سنتے ہیں " ان اللہ فرض علی ائمۃ العدل ان یقدروا نفسھم بضعفۃ الناس " (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۰ صفحہ ۶۵۳)

بیشک خداوند عالم نے بر حق اور عادل اماموں پر واجب کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی سادہ بسر کریں تا کہ معاشرہ کے محروم اور غریب لوگوں کے جیسے ہو سکیں اور یہ فقراء کے لئے تسلی کا باعث ہے.

امام کے یہاں شک و تردید نہیں ہے

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: " ما شككت فی الحق مذ اریته " (جیسے ہی مجھ پر حق روشن ہوا، اس کے بعد سے آج تک میں کسی شک میں مبتلا نہیں ہوا ہوں (نہج البلاغہ / حکمت ۱۸۴) دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں " ولا ضللت و لا ضل بی " (آج تک گمراہ ہوا ہوں اور نہ ہی کوئی دوسرا میرے گمراہ کرنے کا باعث ہوا ہے (نہج البلاغہ / حکمت ۱۸۴)

امام پر ملامتیں اثر نہیں کرتی ہیں

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: " وانی لمن قوم لا تاخذہم فی اللہ لومۃ لائم " میں ایک ایسی قوم سے ہوں جس پر راہ خدا میں ہر گز ملامت کرنے والوں کی ملامتیں اثر نہیں کرتی ہیں (نہج البلاغہ / فیض الاسلام صفحہ ۸۱۷)

امام کو پیشگام ہونا چاہیے

"من نصب نفسه للناس اماما فعليه ان يبدء بتعليم نفسه قبل تعليم غيره وليكن تاديبه بسيرته قبل تاديبه بلسانه " (نہج البلاغہ / فیض الاسلام ۱۱۱۷)

(جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کا امام قرار دے اس پر واجب ہے کہ وہ تزکیہ

اور تعلیم اپنے نفس سے شروع کرے اور اس کی تربیتی روش و تعلیم اس کا اپنا عمل ہونا چاہیے اس سے پہلے کہ وہ زبان کے ذریعہ تربیت کرے۔)

امام کو بے تکلف ہونا چاہیے

خداوندعالم حضرت محمد مصطفے صلی اللہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے لوگوں سے کہو کہ میں تم سے کوئی اجرو پاداش چاہتا ہوں اور نہ ہی تکلف، مشقت اور زورگوئی کرنے والوں میں سے ہوں جو چیز ہے اور واقعیت نہیں رکھتی ہے میں ہرگز اس سے اپنے آپ کو مزین نہ کروں گا میرے کاموں میں اصلاح تصنع نہیں ہے " وماانا من المتکلفین " (سورہ ص /آیۃ ۸۶) تکلف یہ ہے کہ انسان حاضر نہیں ہوتا کہ وہ گمنام لوگوں کی دعوت قبول کرے یا اپنے کسی غلط کام پر عذر خواہی کرے یا جس چیز کو نہیں جانتا ہے اس کو شہامت کے ساتھ کہے، میں نہیں جانتا ہوں، یا جس چیز کو نہیں جانتا ہے اس کو کسی سے پوچھے یا جہاں ضرورت ہو کسی سے مشورہ کرے۔

جو شخص اہل تکلف ہے وہ اپنے سے چھوٹوں کی نسبت ظلم اور بڑوں کی نسبت شخصیت مجروح کرتا ہے۔ یہ تمام چیزیں تکلف و تصنع کی نشانیاں اور (انسان کی) چھوٹی حرکتیں ہیں۔امام لوگوں میں متواضع اور مہربان ترین انسان ہوتا ہے، جیسے ہی لوگ حضرت علیؑ کی طرف احترام کے ساتھ دوڑے آپؑ نے ان کو منع کردیا اور فرمایا، یہ بات اچھی نہیں ہے اور جب لوگ پیادہ رسولؐ کے ساتھ ساتھ راستہ چلتے تو آپ اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ حضرت رسول اکرمؐ اور آئمہ طاہرینؑ کی سیرت میں تواضع اور بے تکلفی کی بہت سی دلچسپ داستانیں دیکھنے کو

ملتی ہیں، جن کے نقل کرنے سے اختصار کی وجہ سے پرہیز کرتے ہیں۔

امام چاپلوس نہ ہو

ایک آسمانی رہبر کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی تربیت کے کرنے میں مہربانی اور نرمی سے پیش آئے نہ کہ دھوکہ دھی اور چاپلوسی سے ان دونوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے ہم یہ کہیں گے، کہ امام کو، عفو، اغماض اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ جن لوگوں کی میں کسی کی نباہ پر کوئی نکتہ ضعف پایاجاتا ہو وہ اس کی پیروی سے مایوس نہ ہو جائیں۔ امام کو جناب یوسفؑ کی طرح ہونا چاہیے کہ اپنے بھائیوں سے فرماتے ہے: "لا تثریب علیکم الیوم" (یوسف، آیہ ۹۲) آج تم پر کوئی ڈانٹ پھٹکار نہ ہوگی۔ ایسی روش لوگوں کو اپنی طرف جذب کر کے اسلام کی طرف مائل کر سکتی ہے۔

جی ہاں امام و رہبر کو مہربان ہونا چاہیے حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: "بعثت بمد اداۃ الناس" (نہج الفصاحہ / ۱۰۹۳) میں لوگوں کے ساتھ مہربانی کرنے کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔

نیز دوسری جگہ فرماتے ہیں، خدا نے مجھے لوگوں کی خاطر و ملارات کا حکم اسی طرح دیا ہے جس طرح مجھے روزانہ کی نمازیں اور واجب امور کے انجام دینے کا حکم دیا ہے۔"ان اللہ امرنی بمد اداۃ الناس کما امرنی با قامۃ الفر ائض" (نہج الفصاحہ / ۲۷۷ سفینۃ البحار) ایک مشہور حدیث میں ہے، ہم پیغمبر لوگوں کی عقل و فہم کے مطابق ان سے گفتگو کرتے ہیں۔ بہت سی روایات میں علماء دانشمندوں کو

تاکید کی گئی ہے کہ وہ جو کچھ جانتے ہوں (وہ سب لوگوں کو) نہ بتایں بلکہ بتانے سے پہلے لوگوں کی عقل و شعور، فہم، مزاج اور حالات کا اندازہ کریں کرو. خلاصہ یہ کہ مہربانی کرنا تمام لوگوں کے لئے ضروری اور رہبری کے لئے شرط لازم ہے.

امام تاریخ سے آگاہ ہو

حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزند سے یوں فرماتے ہیں. اے بیٹا اگرچہ میں نے ان لوگوں کے برابر عمر نہیں پائی ہے جو مجھ سے پہلے چلے گئے ہیں. لیکن میں نے ان کے اعمال، روش اور تلاش و کوشش کے بارے میں فکر اور ان کی تاریخ، آثار اور اخبار کے سلسلہ میں سیر کی ہے اور اب ان کے بارے میں اس قدر جانتا ہوں کہ گویا ان کا یک جزء ہوگیا ہوں[1].

اپنے مقام سے سوء استفادہ نہ کرے

خدا اس سلسلہ میں اپنے رسول کے بارے میں فرماتا ہے "ماکان لبشران یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ" آل عمران / آیہ/ ۷۹ کسی بشر کے لئے بھی سزاوار نہیں ہے کہ خدا جب اس کو حکمت و نبوت سے نوازے تو وہ لوگوں سے کہے کہ میرے غلام بن کے رہو اس لئے کہ بندگی صرف اور صرف خدا سے مخصوص ہے.

۱- " ای بنی انی وان لم اکن عمرت عمرمن کان قبلی فقد نظرت فی اعمالھم و فکرت فی اخبارھم وسیرت فی آثارھم حتی عدت کاحدھم " (نہج البلاغہ / صبحی صالح / وصیت ۳۱ صفحہ / ۳۹۳)

لوگوں کی شکایات کو پہنچے

حضرت علیؑ شکایات پر خصوصی توجہ دیتے تھے آپ متہم کو بلاتے اور اس کے بارے میں تحقیقات اور اس کے مالی حساب پر وقت کرتے تھے، بارہا نمایندوں اپنے سے فرماتے: "فارفع الی حسابک" (نامہ ۴۰ نہج البلاغہ، صفحہ ۴۲) اپنی فعالیت، کارنامہ اور حساب میرے پاس لاؤ اور مجھے حساب دیکھاؤ

صبر و یقین

شرائط اور صفات امام میں سے ایک دوسری صفت یقین ہے قرآن سلسلہ میں فرماتا ہے: "وجعلنا منهم آئمه يهدون بامرنا لما صبرو كانوا باياتنا يوقنون" بنی اسرائیل میں سے جب کچھ لوگوں نے (مصیبتوں) پر صبر کیا تو ہم نے ان کو پیشوا بنادیا جو ہمارے حکم سے (لوگوں کی) ھدایت کرتے تھے اور (اس کے علاوہ) ہماری آیتوں کا سے یقین بھی رکھتے تھے یقین تمام معنوی کمالات، عصمتوں اور آرام و سکون کا سرچشمہ ہے.

آزادی

امام کو چاہیے کہ وہ ہر طرح کے قید وبند اور غیر معبود سے وابستگی مثلاً قوم و قبیلہ اور کسی پارٹی کی وابستگی سے دور ہو.

مادی توقعات نہ رکھتا ہو

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے پانچویں نامہ میں آذر بائجان کے گورنر کو لکھتے ہیں " ان عملک لیس لک بطعمۃ و لکنہ فی عنقک امانۃ " (فیض الاسلام نامہ ۵ صفحہ ۸۳۹)۔ (بیشک تمہارا مقام اور عمل تمہارے لئے ایک امانت اور مسئولیت ہے نہ کہ رزق اور رفاہ زندگی کا وسیلہ۔)

قرآن انبیاء کے امتیازات میں سے ایک یوں بیان کرتا ہے کہ یہ لوگ ہرگز کسی شخص سے بھی مادی توقعات اور انتظار نہ رکھتے تھے[1]۔

صفات امام کا دوسرا گوشہ

امام خدا کی حجت ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے کیسا ہونا چاہیے۔

امام نور ہے حقائق و استعداد اور صلاحیتوں کو روشن اور جہل و شرک ظلم و ستم کے تاریکی پردوں کو اٹھاتا ہے۔ امام امین ہے لوگوں اور ان کی صلاحیتوں کو اپنی طرف جذب نہیں کرتا بلکہ خلق خدا کو خدا کی طرف دعوت دیتا ہے۔ امام تمام علوم، کمالات اور وراثتی تمام امتیازات کا وارث ہوتا ہے۔ امام ثار اللہ ہے وہ بے روح اور مردہ معاشرہ کے پیکر میں ایک پاکیزہ خون ہوتا ہے۔

۱۔ شعراء / آیت ۱۰۹ تا ۱۸۰۔ حضرت نوح، ہود، صالح، شعیب اور جناب لوط کا قول نقل کرتا ہے کہ وہ کہتے " ان اجری الا علی رب العالمین " ہم سوائے اپنے پروردگار کے دوسروں سے کوئی اجر و پاداش نہیں چاہتے ہیں۔

امام کی صفتیں

قال الامام امیر المومنینؑ " ان احق الناس بھذاالامر اقواھم علیه واعلمھم بامر اللہ فیه" (فیض الاسلام صفحہ ۵۵۹ خطبہ ۱۷۳)

حضرت علیؑ فرماتے ہیں " بیشک امت کی رہبری اور اس امر امامت کے لئے سزاوار ترین شخص وہ ہے جو تمام لوگوں کی نسبت قوی اور لائق ہو نیز فرمان خدا کی نسبت زیادہ جانتا ہو قدرت اور علم و آگاہی دوایسی شرط ہیں جوامام کیلئے ضروری ہیں .

دوسری جگہ اسی خطبہ میں فرماتے ہیں . " لایحمل ھذا العلم الا اھل البصر والصبر والعلم بمواقع الحق " (فیض الاسلام ، صفحہ ۵۵۹ ، خطبہ ۱۷۳)

(تنہا وہ شخص اس رہبری کے پرچم کو اٹھا سکتا ہے جو حق کے مواقع سے آشنا اور بصیرت ، علم اور صبر کا مالک ہو .)

امام اور حقوق میں مساوات

حضرت علیؑ اس طرح فرماتے ہیں " انما انا رجل منکم لی ما لکم و علی ما علیکم " (حاشیہ شرح ابن ابی الحدید جلد ، صفحہ ۱۷۶) میں تم میں سے ہی تمہارا جیسا ایک بشر ہوں ، جو تمہارے لئے ہے وہی میرے لئے بھی ہے اور جو نفع نقصان اور حکم تمہارے اوپر لاگو ہے وہی میرے اوپر بھی ہے ہم سب حقوق میں مساوی ہیں .

منافع اسلام کی حفاظت

حضرت علیؑ کو ان کے اپنے مسلم حق سے کنارہ کش اور الگ کردیا گیا لیکن آپ نے صبر کیا، اور فرمایا ہیں۔ اگر مسلمانوں کے امور بخوبی حل ہو جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں میں اپنے اوپر ظلم سہہ لوں گا[1]۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: خدا کی قسم اگر درمیان میں فتنہ و فساد کا احتمال نہ ہوتا تو میں اس روش کے علاوہ کوئی دوسری راہ اختیار کرتا اور مسلحانہ قیام کے ذریعہ اپنا حق لے لیتا (نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۹)۔

جناب ابن عباس نے حضرت علیؑ سے فرمایا: عثمان کی کوشش نفری شوری میں شرکت نہ کیجئے اس لئے کہ (پہلے سے) پروگروم اس طرح طے ہو چکا ہے کہ آپ کو عملی طور پر حذف کردیں گے۔ امام نے فرمایا، چونکہ مدعو کیا گیا ہوں لہذا جاؤں گا اس لئے کہ مجھے وعدہ خلافی اور تکلف پسند نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے جلسہ مختل ہو جائے۔

۱۔ " لقد علمتم انی احق الناس بها من غیری و والله لا سلمن ما سلمت امور المسلمین و لم یکن فیها جور الا علی خاصة " (سیری در نہج البلاغہ۔ صفحہ ۱۸۴)

شیوۂ انتخاب

طریقۂ تعیین رہبر و امام

معاشرہ میں آج کسی بھی عہدہ اور رہبر کے تعیین کا بہترین طریقہ ، طریقہ انتخابات ہے۔ یہ طریقہ ممکن ہے راہ حل ہو لیکن یہ ہر جگہ راہ حل نہیں ہوسکتا ہے اس لئے کہ انتخابات ہرگز واقعیات کو تبدیل نہیں کرتے ہیں کسی حق کو باطل کرتے ہیں اور نہ ہی کسی باطل کو حق۔ اگر حق ہے تو اقلیت کی طرفداری سے باطل نہ ہوگا اور باطل ہے تو اکثریت کی رائے سے حق نہیں ہوگا۔

اور ہرگز کوئی علمی اور عقلی دلیل و برھان یہ نہیں کہتی ہے کہ جس چیز نے ۵۱ افراد کی رائے حاصل کی ہے وہ اس چیز سے بہتر ہے جس نے ۴۹ افراد کی رائے حاصل کی ہے۔ مقام عمل میں اکثریت کی رائے دیکھی جاتی ہے لیکن کیا یہ نشان دہندہ حقانیت و واقعیت ہے ؟ ہرگز نہیں، اصولاً اسلامی حکومت دستور الٰہی پر استوار ہے اور لوگوں (کی اکثریت واقلیت) کو کوئی حق نہیں دیا گیا ہے اس لئے کہ حکومت ، حکومت خدا ہے اور بس۔

اور یہ کتنا اچھا ہے کہ خدا ہی انسانوں کے لئے امام کا تعین کرے، وہ خدا کہ جو بہتر جانتا ہے اور زیادہ مہربان ہے۔ یہ تو رہا ایک طرف۔

اور دوسری طرف تقریباً ۸۰ جگہوں پر قرآن میں اکثریت کی مذمت کی گئی ہے حتی سورہ انعام کی ۱۱۵ ویں آیت میں ارشاد ہے " وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون"

(روئے زمین پر لوگوں کی اکثرت ایسی بھی ہے کہ (اے رسولؐ!) اگر تم ان کے کہنے پر چلو تو تم کو خدا کی راہ سے بہکادیں کیونکہ یہ لوگ تو اپنے شخصی خیالات کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل پچو باتیں کیا کرتے ہیں)

جی ہاں جس اکثریت نے ترقی اور تربیت حاصل نہ کی ہو اس کو مورد عنایت قرار نہیں دینا چاہیے لیکن اب رہا اسلام میں شوریٰ کا مسئلہ تو وہ وضع قانون سے مربوط ہے اور نہ ہی تعیین رہبر ہے بلکہ وہ اجتماعی احکام کی کیفیت اجراء سے مربوط ہے۔

سچ بتائیں کہ کیا رکعات نماز میں مشورے کی کوئی گنجائش ہے۔ پس اگر لوگ کسورہ (مٹی کے برتن) کے اطراف جمع ہو جائیں تو کیا وہ در بن جائے گا یا اگر سونے کو پھینک دیں تو کیا کسورہ بن جائے گا؟

آیات شوری کے علاوہ اکثریت کی رائے معتبر ہونے پر کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ لفظ شورے کے معنی سے سمجھ میں آتا ہے۔ کہ یہ بہترین نظریوں کے استخراج کے معنی میں ہے۔ نہ کہ یہ بیشتر نظریوں کے معنی میں شور

کا لفظ دوسروں کے نظریوں کے بارے میں آشنائی اور عالی ترین نظریات چنے جانے کے لئے وضع ہوا ہے۔ قرآن مسئلہ مشورت کے سلسلہ میں ایک مسلسل بیان کرتا ہے کہ اس کا ایک ضلع اور پہلو، نظریات و مشوروں سے آشنائی پیدا کرنے کے معنی میں ہے۔ دوسرا پہلو انسان کی خود تصمیم گیری کے معنی میں ہے اور تیسرا توکل بر خدا کے معنی میں ہے۔

سچ بتائیں، اگر لوگوں کی اکثریت کو قدرت و طاقت حاصل ہو جائے تو کیا وہ اپنے حق پر قانع ہے یا ظلم اور تجاوز کرے گی؟ کیا اکثر لوگ امین ہیں؟ کیا لوگوں کی اکثریت اپنے منافع اور دوسروں کے منافع کو ایک آنکھ سے دیکھتی ہے؟!

البتہ دانشوروں کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مجتمع افراد کی اکثریت کا ووٹ بسا اوقات اشتباہ ہوتا ہے لیکن اسی کے باوجود لوگ اس کو قبول کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ کیونکہ دوسرے تمام طریقوں میں نقص زیادہ ہیں اور انتخات میں کم ہیں۔ لیکن خدا پر ایمان رکھنے والے مومنین کا معاشرہ روشن آیات و روایات اور نص صریح کے ہوتے ہوئے (سوائے ان کو اجراء کرنے کی صورتوں میں) اپنے اندر اکثریت و شوری کے پیچھے دوڑنے کی ضرورتوں کو محسوس نہیں کرتا ہے۔ بلکہ وہ تو اسی طرح خدا کے حکم و قانوں پر قاطعیت، سرگرمی اور ہر طرح کے خوف و ہراس سے بے بہرہ ہو کہ عمل کرتا ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اکثریت، راہ حل ہے لیکن ہر جگہ راہ حق نہیں ہے عنقریب انتخابات کے بارے میں انشاء اللہ گفتگو ہو گی۔

تلخ تجربے

تاریخ گواہ ہے کہ بارہا انتخابات میں ایسے لوگ اکثریت رائے سے منتخب ہوئے ہیں کہ دیر یا جلد ہی لوگوں پر روشن ہو گیا کہ انتخابات میں دھوکہ ہوا ہے . کیسے کیسے لوگوں کو ہم بہترین انسان سمجھتے رہے اور ان کو رائے دینے کے علاوہ اپنی جانیں تک ان پر قربان کرنے کو تیار تھے لیکن وہ لوگ اس لئے ریا کاری ، تظاہر اور سیاست سے کام لیتے تھے کہ ان کے بارے میں احتمال خلاف کے بھی نہیں ہوتا تھا مگر جب کچھ اس طرح کے واقعات سے سابقہ پڑا تو حقایق روشن ہوئے ، جب انھوں نے پانی سے سر نکالا تو کچھ اور بن کے نکلے مال و مقام نے ان کو بدل ڈالا تھا .

سچ بتائیں ، ہمیں علم غیب تو نہیں ہے آیندہ کے حالات اور لوگوں کے باطن سے بے خبر ہیں پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم کسی شخص کے بارے میں صد در صد صحیح رائے قائم کر سکیں ؟!

سچ بتائیں ، کیا انسان کے حالات قابل تغیر نہیں ہیں کیا شک یقین اور یقین شک میں تبدیل نہیں ہو جاتا ہے ؟ ! کیا خوف و ہراس میں ایمان نہیں بدل جاتا اور ایمان کبھی کبھی ارتداد کی منزلوں تک نہیں پہونچ جاتا ہے ؟ ! ہمارے پاس کتنے ایسے لوگوں کی مثالیں ہیں کہ جو صاحب امید تھے مایوس ہوگئے ، کتنے ایسے لوگ ہیں کہ جن کے بارے میں کسی خیر کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا اچانک حالات نے پلٹا کھایا اور وہ لاکھوں خیر و برکت کے مالک ہو گئے .

فرعون کے مزدور ساحروں نے جناب موسیٰؑ کی آبروریزی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا کہ اچانک موسیٰؑ کے بہترین طرفدار پانی سے نکل آئے اور کیا بلعم باعورا نام کا ایک دانشمند مرد نہیں تھا کہ جو دنیا کی محبت میں اپنے تمام کمالات کھو بیٹھا تھا۔ اس طرح کے نمونے بیان کرنے سے ہماری غرض لوگوں کی رائے اور انتخابات کو کچلنا نہیں ہے بلکہ ہمارا ہدف یہ ہے کہ انتخابات، مجبوریوں اور بند راستوں کے لئے تو راہ حل ہوسکتے ہیں لیکن ایک الٰہی، علمی اور صد در صد قطعی راہ نہیں ہو سکتے ہیں۔

بنابراین ایک بہترین راہ وہی راہ اسلام ہے اور بس۔ البتہ انتخابات کو قرعہ کشی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ جو بعض موارد میں راہ حل ہے نہ کہ ایک علمی او عقلی راہ مذکورہ مطالب کی وضاحت کے لئے امام سجادؑ کی ایک دلچسپ حدیث ہم بحار الانوار جلد ۷۴ صفحہ ۱۸۴ سے نقل کرتے ہیں۔ " اذا رایتم الرجل قد حسن سمته و هديه وتماوت فی منطقه و تخاضع فی حرکاته فرویدا لا یغرکم "

(جس وقت تم کسی مرد کو دیکھو کہ خوش اخلاق ہے اور اس کی شکل و سیرت بھی اچھی ہے خود کو عابد و زاہد او اپنی حرکات و سکنات میں بہت ہی زیادہ شکستہ نفسی کا مظاہرہ پیش کرتا ہے (تو ٹھہر جاؤ اور اسے ایسا کرنے کی) مہلت دو اور جلدی نہ کرو تاکہ وہ تمہیں دھوکہ نہ دے سکے۔)

امام اس صبر کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں۔ "فما اکثر من یعجزه تناول الدنیا و رکوب الحرام منها لضعف بنیته ومهانته و جبن قلبه فنصب الدین

فعالها فهو لا یزال یختل الناس بطاهرة فان تمکن من حرام اقتحمه "

کتنے ایسے لوگ ہیں جو دنیا حاصل کرنے پر مجبور ہیں اور ان کے دنیا تک نہ پہنچنے کا سبب خود ان کی جسمی کمزوری ، عدم لیاقت ، شخصیت و مقام کی کمی اور خوف و ہراس ہے (نہ کہ ایمان وتقوی سبب ہے) کیونکہ کمزور ، بے شخصیت یا ڈرپوک ہیں اس لئے دین کو دنیا تک پہنچنے کیلئے فروخت کرتے اور ہمیشہ لوگوں کو اپنے ظاہر سے دھوکہ دیتے ہیں اگر وہ حرام تک پہنچنے پر قادر ہوتے تو اپنے کو بے اختیار اس پر گرا دیتے ہیں . امام حدیث کی تکمیل اس طرح فرماتے ہیں " واذا وجدتموه یعف عن مال الحرام فرویدا لا یفرکم فان شهوات الخلق مختلفة فما اکثر من یتبوا عن المال الحرام وان کثر و یحمل نفسه علی شوها قبیحة فیاتی منها محرما "

(اور اگر تم دیکھو کہ وہ مال حرام سے بھی پرہیز کرتا ہے تو تب بھی شہر جاو اور اس کی خوبیوں کے بارے میں جلدی قضاوت نہ کرو کیونکہ لوگوں کی خواہشات مختلف ہیں اور کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جو مال حرام سے پرہیز کرتے ہیں حتی مال حرام کی فراوانی بھی ان کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے پاتی ہے لیکن اپنے آپ کو ناپسند اعمال پر وادار اور حرام کے مرتکب ہوتے ہیں)

امام کی حدیث پر غور کریں اور لوگوں کو اچھی طرح پہچانیں امام اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں " فاذاوجدتموة یعف عن ذالک فرویدا لا یغرکم حتی تنظروا ما عقدة عقله فما اکثر من ترک ذالک اجمع ثم لا یرجع الی عقل متین فیکون مایفسده بجهله اکثر مما یصلحه بعقله "

(اور جب دیکھو کہ وہ تمام برے اعمال سے بھی پرہیز کرتا ہے تب بھی اس کو آزماؤ اور دیکھو اس کا انگیزہ عقل کیا ہے تاکہ وہ تمہیں فریب نہ دے سکے اسلئے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو تمام برے اعمال سے پرہیز کرتے ہیں لیکن عقلائی بصیرت نہیں رکھتے ہیں، چونکہ ان کا شعور فکری کم ہوتا ہے لہذا اصلاح کے بجائے فساد پہ ہاتھ ڈالتے ہیں۔) اس کے بعد فرماتے ہیں: " فاذا وجدتم عقله متينا فرويدالا يغركم حتى تنظروا امع هواة يكون على عقله او يكون مع عقله على هواة فكيف محبته للراسات الباطلة وزهدة فيها فان فى الناس من خسر الدنيا والاخرة يترك الدنيا للدنيا...."

(اور اگر دیکھو کہ وہ عقل متین کا بھی مالک ہے تب بھی اس کے فریبی جال سے بچنے کے لئے صبر کرو اور دیکھو کہ وہ اپنے ھوائے نفس کے ذریعہ اپنی عقل کو کچلتا ہے یا یہ کہ اپنے ہوائے نفس کو عقل کے ذریعہ مارتا ہے اور اس کے خلاف قیام کرتا ہے، باطل حکومتوں سے اس کو کسی قدر لگاو اور محبت ہے؟ کیونکہ لوگوں کے درمیان کچھ ایسے بھی لوگ ہیں کہ جو دنیا و آخرت دونوں کے خسارے میں ہیں اس لئے کہ یہ لوگ دنیا کو خدا کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی باطل ریاستوں تک رسائی پانے کے لئے چھوڑتے ہیں۔ ان کی نظر میں ریاست و مقام کی لذت، مال و دنیا کی لذت سے بیشتر ہے۔

آخر میں امام فرماتے ہیں کہ انسان واقعی وہ شخص ہے جو حق کے ساتھ ذلت کو باطل کے ساتھ عزت سے بہتر جانتا ہو (ذلت کی زندگی سے۔ ہے عزت

کی موت بہتر) (بحار جلد ۷۴ / صفحہ ۱۸۴)

اس طویل و عریض حدیث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ . مکر و فریب اور دھوکہ دھی کی ان تمام راہوں اور لوگوں کی ریاکاری و تصنع کے باوجود کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک طرح کی معمولی اور سطحی آشنائی اور معرفتوں کے باعث ، رہبری امت کی تقدیر انتخابات کے ذریعہ لکھ دی جائے . خلاصہ یہ کہ ہم پھر کہتے ہیں ، انتخابات راہ حل تو ہو سکتے ہیں لیکن تمام جگہوں پر راہ حل بھی ہو جائیں ناممکن ہے .

ایک دوسری حدیث میں حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں "اذا کان لک صدیق فولی ولا یہ فاصبتہ علی العشر مما کان لک علیہ قبل ولایتہ فلیس بصدیق سوء " (بحار جلد ۷۴ / ص ۱۵۷) (جب کبھی تمہارا دوست کسی مقام و ریاست کو پہنچ جائے اب اگر وہ اس محبت و وفاداری کا ایک عشر بھی رکھتا ہو جو اس کو تمہاری نسبت اس مقام پر پہنچنے سے پہلے تھی تو وہ دوست برا نہیں ہے .)

توجہ کریں کہ کس قدر ریاست انسان کو بدل ڈالتی ہے . بناء براین کتنے ایسے باوفا اور محبت سے بھرپور افراد ہیں کہ مقام حاصل کرنے کے بعد بدل جاتے ہیں .

یہی تو سارے وجوہات ہیں جن کی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ رہبر کا تعین خدا کی طرف سے ہونا چاہیے وہ عالم الغیب ہے لوگوں کے آئندہ حالات کو جانتا ہے : " اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ " (انعام / آیت ۱۲۴)

ہر فیصلہ حق نہیں ہوتا

جناب جابر سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

"واعلم بانک لا تکون لنا ولیا حتی لو اجمع علیک اهل مصرک و قالوا انک رجل سوء لم یحزنک ولو قالوا انک رجل صالح لم یسرک ذالک ولکن اعرض نفسک علی مافی کتاب الله " (بزرگسالان جلد ۱، صفحہ ۲۳۱)

(اے جابر ! تم ہمارے ولی نہ ہوگے مگر اس وقت کہ جب تمام شہر کے لوگ تمہارے بارے میں اگر کہیں کہ . فلاں مرد برا ہے تو برا نہ ماننا اور اگر کہیں کہ ایک اچھا مرد ہے تو خوش نہ ہونا بلکہ اپنی شناخت کی خاطر خود کو کتاب خدا کے لئے وقف کردینا) اس حدیث سے بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ تمام جگہوں پر لوگوں کی رائے ، قضاوت اور انتخاب (کسی چیز کی) حقانیت یا باطل ہونے پر دلیل نہیں ہے . مسئلہ امامت ، مسائل اعتقادی کا اساسی ترین اور معاشرہ کی ہدایت و رشد کا باعث ہے اور متعدد روایات کے مطابق رہبر حق کے بغیر عبادتیں بھی قبول نہیں ہیں اگر چہ پوری عمر دن رات سخت سے سخت عبادتیں انسان بجالائے .

"والله ،وان رجلا صام النهاروقام الليل ثم لقی الله بغير ولايتنا للقيه وهو غيرراض اوساخط عليه " (بحار جلد ۲۷، صفحہ ۹۰)

(خدا کی قسم اگر کوئی شخص دن کو روزہ رکھے اور رات کو نمازیں پڑھے لیکن ہماری رہبری و ولایت کو قبول نہ کرتا ہو تو روز قیامت اس پر خدا کا غضب برسے

گا یا خدا اس سے راضی نہ ہو گا ۔) اور اس کے باوجود کہ تاریخ میں قوم و ملت کی تقدیریں سنوار نے والا یہی مسئلہ رہبری ہے اور کہ غافل کنندہ ، و وسوسہ و تہدید اور طمع آمیز راہیں باز ہیں ، کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو جھوٹے اور مکار امام اور رہبروں کے حوالے کرکے بہت سے گروہوں کو نیستی و بدبختی کی طرف ڈھکیل دیا ہے ۔ لہذا ان تمام چیزوں کے بعد بہتر کہ ہم شیوۂ تعیین رہبر اور امام حق کو باطل امام سے پہچاننے کی راہوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کریں ۔

لیکن برا نہیں ہے کہ پہلے ہم دنیا میں رائج طریقوں پر ایک نظر ڈال لیں ، اس کے بعد دونوں سے مقائسہ کرتے ہوئے اسلام کی اہمیت کو اجاگر کریں ۔

دنیا میں انتخاب کے طریقے

دنیا میں رہبر حضرات یا تو اچانک قیام و سازش ، ظلم و جور اور اپنے قوت باز کے طریقہ سے لوگوں کی رہبری اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں ، یا اقلیت اور شخصی پارلمینٹ کے ذریعہ منتخب ہو جاتے ہیں یا انتخابات اور رفرنڈم کے راستے اور یا پھر وراثت و جانشینی کے ذریعہ (رہبر بن بیٹھتے ہیں ۔)

اور یہ بات واضح ہے کہ ناگہانی قیام اور سازش کے ذریعہ رہبر بننا ظلم ہے اور اقلیت کے ذریعے معین کرنا ، اکثریت کی رائے کو نظر انداز کرنا ہے اور جانشینی بھی دوسرے پر بار ڈالنا ہے اور رفرانڈم و انتخابات میں بھی کچھ عیوب پائے جاتے ہیں لہذا تنہا راہ حق اور بے عیب راہ الہی رہ جاتی ہے یعنی معصوم رہبر انبیاءؑ کی طرح خدا کی طرف سے معین ہونا چاہیے ۔

تنہا خدا کی طرف سے امام کا انتخاب ہونا چاہیئے

جب خدا وندعالم نے جناب ابراہیمؑ کا امتحان حوادث سے مثلاً جان و مال اور زوجہ و غیرہ کے فوت ہوجانے کے ذریعہ لیا ہے اور وہ تمام الہیٰ امتحانات میں کامیاب ہوگئے تب ان کو خدا نے مقام امامت و رہبری پر فائز کیا اور فرمایا۔

" انی جاعلک للناس اماما " (بقرہ/ آیت ۱۲۴) میں نے تمہیں لوگوں (کی فلاح و بہبودی) کے لئے مقام امامت پر نصب اور فائز کیا ہے۔

مذکورہ آیت کے اس جملے " انی جاعلک " سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ہاتھوں امام منصوب ہونا چاہیے اور بس۔

امام کو انسان اور ہستی پر حاکمیت کے تمام قوانین جاننا چاہیے، امام کو چاہیے کہ وہ جس راہ کو اختیار کررہا ہے اس کے (تمام نشیب و فراز اور) حتمی نتیجہ سے آگاہ ہو۔ امام کو چاہیے کہ وہ اپنی رہبری میں اپنے مفاد کو مدنظر نہ رکھے اور اس کو باطنی و ظاہری عوامل حرکت میں نہ لاتے ہوں، امام کو چاہیے کہ وہ انسانیت کے برجستہ اور عالی ترین صفات سے متصف ہو۔

یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ان (جیسے) شرائط کا وجود معمولی قسم کے لوگوں کے یہاں پایا نہیں جاتا ہے (دوسرے اگر کچھ) لوگوں کے یہاں یہ شرائط پائے بھی جاتے ہوں تو عوام ان سے بے خبر ہوتی ہے۔ فارسی زبان میں ایک شعر ہے۔

ہر چہ بگندد نمکش می زنند وای بہ روزی کہ بگندد نمک

جن لوگوں کے یہاں نقطہ ضعف ، جہل اور انحراف پایا جاتا ہے انہیں واحد شرائط معصوم امام کی رہبری سے ہدایت پانا چاہیے . وائے ہو اس دن پر جب خود رہبر اور امام میں انحراف ، ضعف ، جہل ، تردید اور بخل ، ترس اور غرور و گھمنڈ پایا جائے .

تلخ تجربات

بنابراین ، عوام کو غیر معصوم امام کے حوالے کر دینا بھی انسانیت پر ظلم اور توہین ہے . اور ایسے ہی امام اور رہبری کی شناخت بھی خود عوام کو سونپنا کہ جسے غیب کی خبر نہ ہو . ظلم ہے اور عوام بھی ایسی کہ جس نے معمولاً رشد و ترقی نہ کی ہو اور اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو .

دور کیوں جائیں ان ہی ترقی یافتہ معاشروں کو لے لیجیے اور کہئے کہ فلاں شخص گمنام فلاں گروہ اور حزب سے بہتر ساست داں ، تجربہ کار ہونے کے ساتھ ساتھ انتخاب و تصمیم گیری اور معاشرہ کو رشد دینے کی صلاحیت و قدرت رکھتا ہے تو کیا دنیائے شرق و غرب قبول کرے گی ؟ ہرگز نہیں کیونکہ انسان اپنے فطری تقاضوں اور غرائز کا محکوم ہے اور بہت ہی کم ایسے افراد ہیں ، جو صد در صد حق بین ، حاکمیت ، تنگ نظری اور قبیلہ پرستی وغیرہ سے پاک ہوں ؟!

قرآن میں ہم پڑھتے ہیں کہ لوگوں نے اعتراض کیا کہ کیوں قرآن دونوں قریوں (مکہ و طائف) میں سرشناس اور کسی معروف شخص پر نازل نہیں ہوا ؟!

" وقالوا لولا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم " زخرف / آیت ۳۱)

ترجمہ اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دو بستیوں (مکہ و طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا وہ لوگ خیال کرتے تھے فلاں شخص چونکہ سرشناس، مشہور و معروف اور سرمایہ دار ہے لہذا وحی بھی اس پر نازل ہونی چاہیے تھی ؟ یہ ہے بہت سے لوگوں کے شعور کا نمونہ جیسے ہی جناب طالوت خدا کی طرف سے فوج کے سپہ سالار ہوئے تو بہت سے لوگوں نے ان کی سپہ سالاری کو فقط اس لئے قبول نہیں کیا کہ وہ فقیر اور تہی دست تھے (بقرہ/ آیت ۲۴۷)

کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت رسول اکرم نماز جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ مال تجارت کے (مخصوص) طبل کی آواز بلند ہوئی تو یکایک تمام لوگ رسول خدا کا خطبہ چھوڑ کر بھاگے اور خریداری میں مشغول ہو گئے سوائے چند لوگوں کے کوئی باقی نہ رہا تھا خلاصہ یہ کہ ان (ناریخی) تجربوں کی تلخیوں کے باوجود کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ایک رہبری جیسا مہم مسئلہ لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑدیں. ہرگز نہیں.)

یہ ہے دلیل ہمارے اس عقیدہ کی جو ہم رہبری امت کے مسئلہ میں رکھتے ہیں کہ امام رسول کی طرح صرف خدا کی طرف سے معین ہونا چاہیے. یہاں ہم مرحوم آیت اللہ شہید صدر (قدس سرہ) کا ایک بیان نقل کرتے ہیں کہ جس میں آپ چند مقدمے ذکر کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شیوۂ تعیین امام تنہاراہ انتصاب اور خدا و رسول کی جانب سے ہونا چاہیے اور وہ مقدمات یہ ہیں.

۱۔ ایک طرف رسول ہمیشہ ہر طرح کی تبدیلیاں لانے، ایک بہت بڑے اعتقادی، فکری، علمی اور سیاسی انقلاب کے عہدہ دار اور ایک جاہلی سسٹم کو ایک

نظام اسلامی و انسانی سسٹم میں تبدیل کرنے کے مسئول تھے۔

۲۔ دوسری طرف بعثت کی ۲۳ سالہ مدت، اور وہ بھی اس طرح کہ مسلمانوں پر مکہ میں گھٹن وباؤ اور خوف و ہراس جیسی وضعیت اور مدینہ میں طرح طرح کی مشکلات، جنگوں اور دشمنوں کی سازشوں کا متحمل ہونا واقعاً ۲۳ سالہ مدت اپنی وہ تمام گرفتاریوں کے باوجود اس میں تبدیلی کے لئے کم ہے۔

۳۔ دوسری بات کہ جسے ہم کو فراموش نہیں کرنا چاہیے یہ ہے کہ رسولؐ ناگہاں دنیا سے نہیں چلے گئے ہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ آنحضرتؐ کو امت کی رہبری پر غور و فکر کی فرصت نہیں ملی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ۲۳ سالہ مدت وہ سب تبدیلیاں لانے کے لئے کم ہے جب کہ رسولؐ کے بعد کار رسالت کو جاری رہنا تھا۔

کسی بھی کام کی پائداری ودوام کیلئے چند نظریے ہیں جن پر ہم ایک نظر ڈالتے ہیں

۱۔ یاتو یہ کہیں کہ رسولؐ ایک بے طرف انسان تھے اور وہؐ انقلاب اور لوگوں کی ہدایت کی کچھ فکر کئے بغیر دنیا سے چلے گئے ہیں۔

یہ نظریہ قابل قبول نہیں ہے اس لئے کہ،

ایک معمولی سے معمولی انسان بھی حاضر نہیں ہوتا کہ اپنے اس چھوٹے سے چھوٹے کام کو جس کو وہ (بڑی بڑی زحمتیں اور دشواری کے بعد) انجام دے چکا ہو کسی کے سپرد کئے بغیر ایسے ہی دنیا سے چلاجائے، جب کہ حضرت رسول اکرمؐ نے تو اپنے کار رسالت کی ادائیگی میں ایسے دلسوز تھے کہ قرآن بیان کرتا ہے "حریص

علیکم " (توبہ / آیت ۱۲۸)

رسولؐ تمہارے لئے انگاروں پر لوٹتا ہے اور وہ تمہاری ہدایت کے لئے حریص ہے . دوسری جگہ خداوندعالم اپنے رسولؐ کے بارے میں فرماتا ہے : "لعلک باخع نفسک" (کہف / آیت ۶) گویا تم (اس مصیبت سے کہ کیوں لوگ راہ راست پر نہیں آتے) اپنے آپ کو قتل کر ڈالوگے .

جو رسولؐ اس قدر لوگوں کی ہدایت اور معاشرہ کے اسلامی نظام کے لئے با وفا اور عاشق ہو گیا وہ حاضر ہوگا کہ لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ جائے؟ کیا رسولؐ نے جنگ تبوک کے موقع پر جو اسی (۸۰) دن تک جاری تھی کسی کو اپنی جگہ پر نہیں چھوڑا تھا ؟!

آیا ابوبکر حاضر تھے کہ لوگوں کو یونہی چھوڑجائیں اور ان کو عمر کے حوالے نہ کریں ؟ کیا قبول کیا جاسکتا ہے کہ ابوبکر تو اپنے بعد مسلمانوں کے لئے فکر مند ہوں لیکن حضرت محمد مصطفےؐ نہ ہوں ؟ لہذا یہ نظریہ قابل نہیں ہے .

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ رسولؐ دنیا سے چلے گئے اور امت کی رہبری خود شوری اور لوگوں کے انتخاب پر چھوڑ گئے ہیں .

یہ نظریہ بھی سوال طلب ہے کہ کیوں ابوبکر نے رسولؐ کی طرح امت کی رہبری کو شوری پر نہیں چھوڑا اور شخصاً دخالت دی اور عمر کو منصوب کیا ؟!!!

کیوں عمر نے رہبری امت کے مسئلہ میں رفرنڈم سے کام نہیں لیا ؟! بلکہ ایک شوری تشکیل دی جو چھ (۶) افراد پر مشتمل تھی اور وہ بھی ایک ایسی شوری کہ

جو آمرانہ تھی کیونکہ کہہ دیا تھا کہ اس شوری میں وہ شخص رہبر اور خلیفہ ہوگا کہ جس کی تائید ان چھ افراد میں سے عبد الرحمن ابن عوف کرے گا ؟!

یہ کیسی شوری ہے کہ جس کے اراکین میں ایک شخص کو دخالت کا اتنا حق حاصل ہو کہ وہ جس گروہ کے ساتھ ہوگا اسی کا نظریہ قابل قبول ہوگا یہ شوری ہے یا ڈکٹیٹری ؟!!

دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ دوسرے نظریہ کے مطابق ماجرائے غدیر خم کا کیا جواب دیا جائے گا ؟!!

اب جب کہ دونوں نظریے قابل قبول نہیں ہیں. تنہا ایک راہ باقی رہ جاتی ہے جو ایک تیسرا نظریہ ہے کہ خود وہ رسولؐ کہ جو لوگوں کے لئے اس قدر دلسوز ہے وہی کسی ایسے شخص کو جو مکتب کی شناخت اور عملی لحاظ سے معاشرہ کی رہبری، رشد اور اداوہ کرنے کی صلاحیت و قدرت تمام لوگوں سے بہتر رکھتا ہو اور ہر طرح کی علمی و فکری صلاحیت کا مالک ہو اور جو بہترین تجربہ کار ہو اس کو اپنی امت کی رہبری کے لئے نصب اور منتخب کرے اور لوگوں کو اس کی شناخت کرائے.

ایک دلچسپ نکتہ

ایک نکتہ جس پر توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ قرآن نے مسئلہ امامت کو کلمہ (عہدی) سے تعبیر کیا ہے، جس وقت جناب ابراھیمؑ نے مقام امامت کو اپنی اولاد کے لئے مانگا تو خدا نے جواب دیا کہ میرا عہد (کہ جو وہی مقام امامت ہے) ظالموں تک نہیں پہنچے گا " لاینال عھدی الظالمین " (بقرہ/ آیت ۱۲۴)

اب جب کہ امامت خدا کا عہدو پیمان ہے تو ہم کو شوریٰ کے ذریعہ حل نہیں کرنا چاہیے کیونکہ شوریٰ تولوگوں کے کاموں سے مربوط ہے نہ کہ عہد خدا ہے۔ لہذا ان دو آیتوں میں جہاں مسئلہ شوریٰ کو بیان کیا گیا ہے (امرا) کی لفظ آئی ہے "و امرھم شوریٰ" لوگوں کے امور مشورہ اور ایمان کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ یا رسولؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ "وشاورھم فی الامر" لوگوں کے بارے میں خود انہیں سے مشورہ کرو۔ توجہ کی آپ نے کہ مشورہ کا مورد دنوں آیتوں میں لوگوں کے کام اور اجتماعی مسائل سے مربوط ہے لیکن ہرگز مسئلہ امامت کہ جو خدا سے عہد و پیمان ہے، کو شامل نہیں ہے امید ہے کہ اس پر غور کریں گے۔

ایک اور تلخ تجربہ

جناب موسیٰؑ نے بنی اسرئیل سے ستر ہزار افراد کا انتخاب کیا اور ان کو اپنے ساتھ وعدہ گاہ تک لے گئے لیکن ان کی ایک احمقانہ مانگ کے سبب تمام کے تمام غضب خدا کے مستحق قرار پائے اور موسیٰؑ جیسے اولوا لعزم نبی کا انتخاب بھی غلط ثابت ہوا (اعراف / آیت ۱۵۵) ان جیسے تجربوں کے باوجود جیسا اطمینان ہم کو رکھنا چاہیے وہ ہمارے پاس نہیں ہے لہذا بہتر ہے کہ ہم انتخاب کی ذمہ داری ایک ایسی ذات پر ڈال دیں جو حقائق، اسرار اور آیندہ کے بارے میں زیادہ آگاہ ہے۔

انتخابات کے طبیعی نقائص

انتخابات اور رفرنڈم باوجود کہ بہت سی جگہوں پر ایک بہترین راہ حل ہے

لیکن کچھ برے نقائص بھی طبیعی طور پرہیں کہ ان سے ہمیں چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے اور وہ نقائص یہ ہیں،

۱۔ ہر انسان کسی نہ کسی شخص کا انتخاب ضرور کرتا ہے لیکن انتخاب کرنے اور منتخب ہونے والوں کے درمیاں رقابتیں اور رنجشیں پائی جاتی ہیں کہ جو خود ایک طرح سے تضاد، ہرج و مرج اور کدورت آور ہیں۔

۲۔ انتخابات میں جیت کر آنے والا ہر شخص بطور طبیعی اپنے رائے دہندگان کی حمایت کرتا ہے اور تنہاوہی لوگ اس کے نزدیک اہمیت رکھتے ہیں۔

بناء براین حمایت، موقع شناسی اور دفاؤں میں حقانیت کے علاوہ رائے دہندگان کی مانگ اور تمائل کے موضوع کو بھی ملاحظہ کرنا ہوگا۔ جو ایک طرح کا شرک ہے کہ انسان خدا اور اس کی راہ کے علاوہ دوسروں کو راضی کرنے کی فکر میں رہے۔

۳۔ جو شک، خطا، سہو اور فطری تقاضے ہم کو شب و روز مخالف سمتوں کی طرف ڈھکیل دیتے ہیں ممکن ہے تعیین رہبر کے سلسلہ میں بھی وہی اشتباہات عواطف اور جنسی غرائز انسان کی مسیر کو حق سے منحرف کر ڈالے۔

۴۔ خود منتخب ہونے والے افراد کے لئے بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کل کہاں اور کس تلخ یا شیرین حادثہ میں اپنی جہت بدل ڈالیں؟!

لوگوں کے انتخابات اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان نقائص کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔

راہ حق

شیوہ تعیین امام کی راہ حق وہی راہ ہے جس کو قرآن بیان کرتا ہے کیونکہ ہم امامت کو نبوت جیسی اور امام کو رسولؐ جیسا مانتے ہیں حتی ہمارے نزدیک ضرورت امام اور ضرورت رسولؐ کی دلیلیں بھی ایک ہیں اور امام کا کام رسولؐ کے کام مثلاً ہدایت و رشداور انسانی معاشرہ کو سعادت واقعی کی راہوں پر گامزن کرنے سے مشابہ ہے لہذا جس آیت کو ہم نے " یعنو دلیل " نبوت کی بحث میں ذکر کیا ہے اسی کو یہاں بھی مورد استفادہ قرار دیتے ہیں .جو یہ ہے "ان علینا للھدی" (اللیل / آیت ۱۳)

(بیشک ہدایت کی ذمہ داریاں ہمارے اوپر ہیں) جیسا کہ رسولؐ کو منتخب کرنا خدا کا کام ہےاوربہت سی آیتیں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں [۱]. تعیین امام بھی کہ جو لوگوں کی ہدایت اور خدا سے عہد و پیمان ہے خدا کی طرف سے ہونا چاہیے .

ابو علی سینا کا بیان

ابو علی سینا یہاں فرماتے ہیں کہ امام کو معصوم اور صفات عالی سے متصف ہونا چاہیئے چونکہ انسان کے لئے ان صفات اور روحیات کا مالک ہونا کوئی معنی نہیں

۱۔ وہ آیات کہ جن میں اصطفاء ، بعثت ، جعل ، اختیار کی لفظ استعمال کی گئی ہیں اگر ان کے بارے میں تحقیق کی جائے تو ہمارا بیان ،بخوبی روشن ہو سکتا ہے .

رکھتا ہے کہ ایک معمولی انسان اس کو سمجھ سکے اور اگر کچھ سمجھ بھی لے گا تو ناقص سمجھے گا اور وہ بھی صرف علائم کے ذریعہ کسی ایک مسئلہ کو سمجھ سکتا ہے .

لہذا چاہئے کہ خدا امام کا تعین کرے کیونکہ اسی کی ذات ہے جو لوگوںکے اسرار سے واقف ہے، عالم الغیب ہے اور ہماری واقعی سعادت کی راہوں سے بھی آگاہ ہے.

وہ جگہیں جہاں انتخاب نہیں ہے

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے . " وما کان لمومن ولا مومنۃ اذاقضی اللہ و رسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم .... " (احزاب / ۳۶)

جن موارد میں خدا اور رسولؐ نے باایمان مرد و عورت کے لئے کوئی حکم، قانون یا کسی شخص کو کسی مقام اور کام کے لئے چن لیا ہو تو لوگوں کو (چون، چرا اورکرنے انتخاب کا حق نہیں ہے.نیز سورہ قصص کی ۶۷ ویں آیت میں ارشاد ہوتاہے.

"وربک یخلق ما یشاء و یختار ما کان لھم الخیرۃ " (تمہارا خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) منتخب کرتا ہے اور یہ انتخاب لوگوں کے اختیار میں نہیں ہے) تفسیر صافی میں بہت سی روایات بیان ہوئی ہیں کہ جب بھی خداوند عالم کسی شخص کو امامت کے منصب پر فائز کرے تو لوگوں کو کسی دوسرے کے پاس نہیں جانا چاہیے .

دوسری حدیث میں ہے . جب انتخابات میں انحرافی کے امکان پائے جاتے ہوں تو انتخاب کی اہمیت کم ہو جاتی ہے لہذا وہی انتخاب صد در صد اہمیت کا حامل

ہوگا جو اس خدا کی طرف سے ہو جسے انسانوں کے باطن اور آئندہ کے حالات سے آگاہی ہے۔ (۱)

انتخاب راہ حق

ہم بیان کر چکے ہیں کہ راہ حق وہی الٰہی راہ ہے کہ جس کا ذکر قرآن و احادیث میں ہوا ہے، اس کا ایک نمونہ واقعۂ غدیر خم کے ہے۔

۱۰ھ رسول اکرمؐ کی عمر مبارک کا آخری سال تھا، طے پایا کہ رسولؐ مدینہ سے مکہ (حج کی غرض سے) جائیں۔ جیسے ہی لوگوں کو خبر ملی تو انھوں نے کوشش کی کہ اس سفر میں رسول خداؐ کی خدمت میں بھی رہیں اور مناسک حج بھی بجالائیں۔ آخر کار ایک بہت بڑا قافلہ رسول اکرمؐ کی ہمراہی میں مکہ کی طرف چلا اور جب فریضۂ حج ادا کرکے واپس مدینہ آرہا تھا تو ایک چہار راہ پر پہنچا کہ جہاں سے مسلمانوں کو جدا ہونا تھا، وہاں سے ایک راستہ شمال کی جانب مدینہ جاتا تھا اور ایک مشرق کی طرف عراق کے لئے تیسرا سرزمین مصر کے لئے مغرب کی جانب اور، چوتھا جنوب میں یمن کی طرف جاتا تھا۔

۱۰ھ رسول خداؐ کی عمر شریف کا آخری سال ہے یہ سال آنحضرتؐ سے لوگوں کی جدائی کا، لوگوں سے عہد و پیمان باندھنے کا وعظ و نصیحت اور آخری پیغام کے عنوان سے، سندنامہ پڑھے جانے کے علاوہ آخری اور مہمترین بیانات

۱۔ تفسیر صافی میں اس آیت کے ذیل میں چند احادیث کا مضمون ہم نے یہاں بیان کردیا ہے۔

ارشاد کرنے کا سال ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمان جاری کیا کہ تمام لوگ یہاں (غدیر خم) پر جمع ہو جائیں۔ بروز پنجشنبہ عید قربان سے آٹھ روز بعد (۱۸ ذی الحجہ ۱۰ھ کو) تمام لوگ حکم رسولؐ کے مطابق ٹھہر گئے جو لوگ آگے بڑھ گئے تھے ان کو واپس بلا کے کہا گیا کہ وہ انتظار کریں تاکہ پیچھے آنے والے قافلے بھی پہنچ جائیں۔ تیز اور چلچلاتی دھوپ تھی، ریت پاؤں کو جلا رہی تھی، ایک (یاسوا) لاکھ کا مجمع تھا، نماز ظہر رسول خداؐ کی اقتدا میں پڑھی گئی اور یہ اس چار راہ پر مہمترین پیغام کے سنانے کی کاروائی شروع ہوئی، اونٹ کے کجاووں کا منبر بنایا گیا، رسول خداؐ اس پر تشریف فرماہوئے اور فرمایا، کیا سب لوگ میری آواز سن رہے ہیں، سب نے بیک آواز کہا ہاں۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے حمد خدا، توحید و رسالت اور معاد وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لوگوں سے اپنی فعالیت و تبلیغ کے بارے میں پوچھا سب نے تعریف کی۔ اس کے بعد فرمایا، میرا وقت آن پہنچا ہے قریب ہے کہ میں بلا لیا جاؤں اور دعوت حق پر میں لبیک کہہ دوں، میں بھی مسئول ہوں اور تم لوگ بھی مسئول ہو اور پھر لوگوں سے توحید، رسالت اور قیامت کے بارے میں اقرار لیا۔

اس کے بعد فرمایا، میں تمہارے درمیان دو گرانبھا چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک قرآن ہے اور دوسرے میرے اہلبیتؑ ہیں کہ یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے لہذا ہمیشہ خیال رکھو کہ کبھی ان سے آگے بڑھنا اور نہ

ہی پیچھے رہ جانا (اسی میں تمہاری کامیابی کا راز مضمر ہے)

اس کے بعد رسولؐ نے مجمع پر سرسری نظر ڈالی اور علیؑ کو تلاش کیا، قریب آئے اور ان کو لیکر منبر پر پہنچے، علیؑ کے ہاتھوں کو اس طرح بلند کیا کہ تمام لوگوں نے پہچان لیا اور بلند آواز میں فرمایا لوگوں میں کون شخص ایسا ہے کہ جو خود مسلمانوں کی نسبت زیادہ سزاوار ہو، سب نے کہا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتا ہے۔

تو اس وقت آپؐ نے فرمایا: (جس کا میں مولا و حاکم ہوں اس کے یہ علیؑ بھی مولا و حاکم اور رہبر ہیں) اور یہ جملہ کو بار بار فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ نے دعا کی ان لوگوں کے حق میں جو علیؑ کو دوست رکھیں اور لعنت و ملامت بھیجی ان لوگوں پر جو حضرتؑ سے دشمنی مول لیں۔

اگرچہ میں نے سوچا تھا کہ ماجرائے غدیر خم کو روشن ہونے کی وجہ سے نہ لکھوں گا لیکن میں نے سوچا ہے کہ کم از کم ایک اشارہ ہی اس کی طرف ہوجائے۔ کیونکہ واقعہ غدیر کی تفسیر کرنا ایسے ہی ہے کہ جیسے نوراور سورج کی تفسیر کرنا۔ کیونکہ داستان غدیر ایک ایسی داستان ہے جسے شیعہ و سنی دونوں کے ہزاروں بزرگوں نے نقل کیا ہے۔ اور دسیوں کتابیں اس سلسلہ میں لکھی گئی ہیں۔

بہترین شخص کا انتخاب

حضرت علیؑ کا انتخاب ایک غیر حکیمانہ نہیں تھا بلکہ ان کا زہد و تقوی، ادب و اخلاق، عرفان، واخلاص اور ان کی عبادتیں تمام لوگوں پر عیاں اور روشن تھیں۔ یہاں تک کہ کسی دشمن نے بھی حضرت علیؑ کی کسی کمی کو، بیان نہیں کیا ہے۔

تنہا یہ علیؑ ہی کی ذات ہے کہ جس نے کسی بت کی طرف رخ نہیں کیا ہے وہ بچپن سے ہی خدا پرست تھے۔

ایک ایسے شخص تھے کہ شب ہجرت جب دشمنوں نے رسول خداؐ کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا تو آنحضرتؐ کی جگہ سوگئے اور رسولؐ صحیح و سلامت گھر سے نکل کر (مدینہ کی طرف) ہجرت کرگئے۔

حضرت علیؑ وہ تنہا شخص تھے جنھوں نے بت پرستوں کو مراسم حج میں شرکت سے روکا اور آیدی سورہ برات لیکر بکمال شھامت مکہ پہنچے اور بت پرستوں کے روبرو کھڑے ہوکر پڑھنا شروع کیا کہ آج کے بعد تم لوگوں کو مکہ میں داخل ہونے کا حق نہیں ہے۔

خود حضرت رسول اکرمؐ کی طرف سے ہزاروں کمالات اور سفارشات و نصیحتیں مختلف طریقوں سے حضرت علیؑ کے بارے میں نقل ہوئی ہیں اور امام کے فضائل سنی اور شیعہ دونوں کی بہت سی کتابوں میں موجود ہیں انشاء اللہ اس کا کوئی ایک گوشہ ہم آیندہ بیاں کریں گے لہذا یہاں گفتگو تمام کرتے ہیں۔

ایک سوال

ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ امت کے امام کا تعیین خدا کی طرف سے ہونا چاہیے اور لوگوں کے انتخابات تلخ تجربوں اور لوگوں کے آیندہ حالات و اسرار سے عدم آگاہی کے سبب کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔

تو یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

نہج البلاغہ میں کیوں فرماتے ہیں ، قتل عثمان کے بعد لوگوں نے میرا انتخاب کیا جب کہ لوگوں کی رائے مخالف سمت کھینچتی ہے دوسرے نظام جمہوری اسلامی میں لوگوں کی رائے کیوں لی جاتی ہے ؟

جواب

یہاں حضرت علی علیہ السلام چاہتے ہیں کہ مخالفین کے نظریہ کے مطابق گفتگو کریں یعنی تم لوگ جو اتنا لوگوں کا دم بھرتے ہو وہی لوگ ہیں کہ جنھوں نے مجھے قبول کیا ہے اور نظام جمہوری اسلامی ایران میں لوگوں نے چونکہ راہ حق کو پہچان لیا ہے اور امام خمینیؒ کی رہبری کو طاغوت پر اور نظام جمہوری اسلامی کو شہنشاہی نظام پر ترجیح دیا ہے . لہذا ہم نے بھی اپنے اس نیک انتخاب کو دنیا وی رخ دیا ہے تاکہ تہمتوں کے مستحق نہ ٹھرائے جائیں اور لوگ نہ کہہ سکیں کہ تمہارا انتخابی طریقہ کار بھی ایک دکٹیٹری طریقہ کار ہے .

ورنہ یہی امام خمینی (رہ) رہبر انقلاب اور بانی جمہوری اسلامی معزول رئیس جمہور سے کہ جو لوگوں کی ہوا داری پر افتخار کررہا تھا ، فرماتے ہیں اگر تم اپنے کاموں کو غیراسلامی روش پر جاری رکھو گے تو میں تمہاری مخالفت کروں گا اگرچہ تمام لوگ تمہارے ساتھ ہوں .

توجہ کریں ، رفرانڈم کے طریقے بھی ایران میں اسی وقت قابل افتخار ہیں جب انتخابات کے علاوہ راہ حق پر ہوں ورنہ جیسا کہ تمام بلب جب تک بجلی سے اتصال پیدا نہ کریں روشنی نہیں پہنچا سکتے ہیں (بالکل اس طرح) جب تک تمام

لوگوں کی رائے و حی اور راہ خدا کے وسیلہ سے نورانی نہ ہو الٰہی اہمیت ان کو حاصل نہ ہوگی اگرچہ غیراسلامی معاشروں کی نظر میں انسانی اہمیت رکھتی ہو۔ دوسرے ہم بھی اس سلسہ میں نہیں چاہتے ہیں کہ انتخابات کو بطور کلی نظر انداز کر دیں بلکہ ہمارا شعار یہ ہے کہ انتخابات تمام جگہوں پر راہ حق کو طے نہیں کرتے ہیں اور انتخابات صد در صد دلیل عقلی نہیں ہیں۔ لوگوں کے انتخابات کو خدا کے بزرگ کے انتخاب کے مقابل کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ ہے ہماری گفتگو کا ماحصل ورنہ بہت سی جگہیں ایسی ہیں کہ جہاں انتخابات محترم اور ناگہانی سازش و قیام کے بل بوتے پر ہونے والے انتخابات، جانشینی اور نظریۂ اقلیت کو تحمیل کرنے سے بہتر ہیں، فقط خدائی انتخاب کے مقابل صحیح نہیں ہیں۔

چند فضیلتیں

علیؑ اور اہلبیتؑ کے کچھ فضائل

حضرت علیؑ اور اہلبیت اطہارؑ کے بہت زیادہ فضائل ہیں، ہم شناخت امام کے لئے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلامؑ نے جناب فاطمہ زہراؑ کے ساتھ ملکر اپنے دونوں عزیز بیٹوں کی شفایابی کے لئے منت مانی کہ تین روزے رکھیں گے۔

پہلے دن جب سورج غروب ہوا اور چاہا کہ افطار کریں کہ کسی فقیر، مسکین نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا، میں بھوکا ہو، اہلبیت اطہارؑ نے اپنی اپنی روٹی اس کو دے دی اور پانی سے افطار کیا۔

دوسرے دن بھی ایسے ہی روزہ رکھا، نماز مغرب کے بعد جیسے ہی چاہتے تھے کہ افطار کریں ایک شخص در امام پر آیا اور کہا میں یتیم اور بھوکا ہوں، امام سمیت سبھی لوگوں نے اپنا افطار اس یتیم کو دے دیا کہ جو بڑی مشقت سے تیار ہوا تھا اور پانی سے آج بھی افطار کیا گیا۔

تیسرے روز بھی جیسے ہی افطار کا وقت ہوا کسی شخص نے سوال کیا، میں ایک اسیر اور قیدی ہوں میری مدد کیجے میں بھوکا ہوں لہذا عین دن کے بھوکے ہونے کے باوجودہ کھانے کی کتنی سخت ضرورت تھی مگر سب نے اپنا اپنا کھانا اس قیدی فقیر کو دے دیا۔

دوسرے دن (یا اسی شب) جب پریدہ رنگ چہروں کے ساتھ خدمت رسولؐ میں پہنچے ہیں (یا خود رسولؐ خیر گیری کے لئے آئیں ہیں) تو رسولؐ نے بشارت اور خوشخبری سنائی کہ ایک پورا سورہ ان کی شان میں نازل ہوا ہے کہ انھوں نے اپنی اپنی روٹیاں باوجود اس کے کہ سخت بھوکے تھے خدا سے عشق کی خاطر مسکین، یتیم اور اسیر کو خود اپنے ہاتھوں سے دے دی۔ اور اہم بات یہ ہے کہ ان کے دلوں میں کسی تشکر اور پاداش کا ارادہ تک نہیں تھا، وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے اعمال کی کوئی سند اپنے آیندہ کے لئے محفوظ کرلیں۔ ان کا ہدف رضائے معبود کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ " ویطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً و یتیماو اسیراً انما نطعمکم لوجہ اللہ لانرید منکم جزاء ولا شکوراً " وہ لوگ اس کی محبت میں محتاج، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو بس تمہیں خالص خدا کے لئے کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلہ کے خواستگار ہیں اور نہ ہی کسی شکر گذاری کے)

یہ داستان تمام شیعہ علماء نے نقل کیا ہے اور علامہ امینی (رہ) نے اپنی کتاب الغدیر جلد ۳ صفحہ ۱۱۱ پر، اہلسنت کے ۲۴ بزرگ علماء سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

ایک اور داستان

حضرت علیؑ شیبہ اور عباس نام کے دو افراد کے قریب سے گذر رہے تھے۔ آپ نے شیبہ کو کہتے ہوئے سنا کہ میں مسجد الحرام کا نگہبان اور تعمیر کرنے والا ہوں اور جناب عباس کہہ رہے تھے کہ حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری میری ہے گویا وہ لوگ ایک دوسرے سے اپنا اپنا افتخار بیان کر رہے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا، ویسے تو مجھے تم لوگوں سے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن اتنا یاد رکھو کہ مجھے کمسن ہونے کے باوجود ایک ایسا فخر حاصل ہے کہ جو تمہیں نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے شمشیر سے جہاد کیا ہے تاکہ تم لوگ خدا و رسولؐ پر ایمان لے آو۔ یہ بات ان لوگوں پر گران گزری۔ عباس ناراض ناراض خدمت رسولؐ میں پہنچے اور شکایت کی۔ آنحضرتؐ نے علیؑ کو آواز دی اور فرمایا، کیوں تم نے اپنے چچا (عباس) سے اس طرح کی گفتگو کی ہے؟

حضرت علیؑ نے فرمایا، میری بات غلط نہیں تھی، اس وقت جبرئیلؑ یہ آیت لیکر نازل ہوئے کہ، " اجعلتم سقایه الحاج وعمارة المسجد الحرام کمن امن بالله و الیوم الاخی وجاہد فی سبیل الله " (توبہ/آیت ۱۹/تفسیر نمونہ جلد ۷، صفحہ ۔ ۳۲۱)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کی سقائی اور مسجدالحرام (خانہ خدا) کو آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے جو خدا اور روز آخرت پر ایمان لایا اور خدا کی راہ میں جہاد کیا (خدا کے نزدیک تو یہ لوگ برابر نہیں ہیں اور خدا ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا ہے) ہرگز نہیں بلکہ مقیاس فضیلت ایمان اور جہاد ہے۔

وہ کام جو ملائکہ بھی نہ کر سکیں

جس وقت رسول خداؐ نے (مدینہ کی طرف) ہجرت کا قصد کیا تو حضرت علیؑ کو امانتوں کے واپس کرنے اور قرض کی ادائیگی کی خاطر مکہ میں چھوڑ دیا اور فرمایا،

اے علیؑ! آج رات جب کہ دشمنوں نے ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا ہے اور میرے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں تم میرے جگہ سو جاؤ. حضرت علیؑ اس رات جو کہ خطرات سے پر تھی رسول خداؐ کی جگہ سو گئے.

خداوند عالم نے اپنے دو عزیز فرشتوں جبرئیل ومیکائیل سے فرمایا، میں نے تم میں سے ایک کی عمر طولانی کردی ہے تم میں سے کون ہے جو دوسرے پر قربان کرے؟ دونوں فرشتوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں ہوا. خدا نے ان پر وحی نازل کی کہ دیکھو علیؑ کس طرح اپنی جان رسول خداؐ پر نثار کر رہے ہیں.. اس شب کا تاریخ میں نام "لیلۃ المبیت" ہے.[1] اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی "ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ و اللہ روف بالعباد"[2] (لوگوں میں سے کچھ (خدا کے بندے) ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور خدا ایسے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے.)

البتہ حضرت علیؑ کی شناخت کے بارے میں چند سطریں لکھنا شاید آپؑ کے مقام کی توہین کا باعث ہو کیونکہ قرآن میں بہت سی آیات آپ کی شان میں نازل

۱۔ "الغدیر جلد ۲ صفحہ ۴۸۔ بحار جلد ۱۳۰ / صفحہ ۴۷ تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۳۴۲

۲۔ سورہ بقرہ / آیت ۲۰۷.

ہوئی ہیں لیکن ہمارا ہدف اس کتاب سے نسل نو کو الفبائے اسلام سے آشنا کرنا ہے اور یہ معصوم رہبروں کی شناخت کے لئے پہلا اقدام ہے۔

امام کا گھر ملائکہ کی جگہ ہے

اب جب کہ میں یہ کلمات لکھ رہ ہوں ماہ رمضان کی ۲۱ تاریخ ہے لہذا برا نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں امامت سے متعلق جو بات ایک حدیث میں، میں نے پائی ہے قلم بند کروں اور وہ یہ کہ،

شب قدر کسی ایک سال سے مربوط نہیں ہے بلکہ ہر سال آتی ہے۔

اور اس رات آیات قرآن کے مطابق ملائکہ زمین پر نازل ہوئے ہیں۔

رسولؐ کے زمانے میں یہ فرشتے خود رسول خداؐ پر نازل ہوئے تھے۔

زمانہ رسولؐ کے بعد بھی شب قدروں میں ملائکہ نازل ہوتے ہیں آخر کس شخص کے پاس؟ (کبھی غور فرمایا۔)

آیا ہر ایک انسان پر یا اس شخص پر جو تمام کمالات میں خدا اور رسولؐ کے نزدیک قریب ترین شخص ہو امام کے اس بیان سے جو اصول کافی میں ہے[1] کہ مقام امامت سے بھی اور جس زمانے میں آسمانی فرشتے نازل ہوتے ہیں اس میں زندہ معصوم امام کی ضرورت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔

۱۔ اصول جلد کافی، ۱/ صفحہ ۲۴۹/ فی باب شان انا انزلناہ فی لیلۃ القدر

کیوں علیؑ کا نام قرآن میں نہیں ہے ؟

پہلے تو یہ کہ دوسروں کا نام بھی قرآن میں نہیں ہے۔ دوسرے قرآن میں کچھ ایسے مواقع بھی آئے ہیں جو بعض لوگوں کے ذوق و سلیقہ کو چونکہ نہیں بھائے ہیں۔ لہذا ان کو بکمال شہامت انھوں نے مسیر حقیقی نے نکال دیا ہے حتی بعض جگہوں پر کہا کہ جو مسائل زمانہ رسولؐ میں حلال تھے میں ان کو حرام قرار دیتا ہوں !!!

کیا اس روحیہ اور حالت کے باوجود اگر حضرت علیؑ کا نام قرآن میں ہوتا تو قرآن کے لئے کوئی خطرہ پیش نہ آتا ؟! اور قرآن کو رد و ایراد اور اثبات و انکار کے مقام پر کھڑا نہیں کیا جاتا ؟

اس کے علاوہ مثل مشہور ہے کہ جیسا لوگ کہتے ہیں، "پیر اڑانا گود میں لینے سے بہتر ہے" اگر ہم صفات اور ایسا امعیار لوگوں کو پیش کریں کہ وہ خود (دوسروں سے) مقائسہ کرتا پھریں کہ بہتر ہے اس سے کہ ہم انکے نام لیتا کہ ڈکٹیڑی کا پہلو نظر نہ آئے۔

فضائل علیؑ کے گوشہ کی فہرست

بارہا رسول اکرمؐ نے علیؑ کو اپنا بھائی کہا ہے۔ (الغدیر جلد ۳، صفحہ ۱۱۵ - ۱۲۲) جنگ خندق میں حضرت علیؑ کی ایک ضربت تمام لوگوں کی عبادت پر بھاری بتائی گئی ہے۔ (تفسیر فخررازی جلد ۳۲، صفحہ ۳۱، ذیل آیت شب قدر)۔

حضرت علیؑ پہلے شخص تھے کہ جو حضرت رسول خداؐ پر ایمان لائے۔ (اس مضمون کی تقریباً سو / ۱۰۰۔ حدیثیں الغدیر جلد ۳ میں بیان ہوئی ہیں)

اسلام میں پہلا سجدہ شکر وہ سجدہ ہے کہ جو حضرت علی علیہ السلام بجالائے اور وہ بھی اس لئے کہ رسولؐ کی اس جگہ سونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور رسول اکرمؐ صحیح و سلامت ایک ایسے گھر سے مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے ہیں۔ جو دشمنوں کے محاصرہ میں تھا۔ متعدد روایات نے علیؑ کو انسانوں میں بہترین بشر کے کیا ہے۔ اور وہ ہرگز حق سے جدا ہونگے اور نہ ہی قرآن سے اوروہ دنیا و آخرت کے سید وسردار ہیں۔ ان کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت اور ان کے ماننے والے بہترین خدا کی مخلوق ہیں۔ [1]

۱۔ یہ تمام پرفضائل کتاب فضائل الخمسۃ من الصحاح الستہ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

امام و امت کے حقوق

امام و امت کے متقابل حقوق

بحار الانوار کی ۲۷ ویں جلد میں بہت سی حدیثیں اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں۔ ہم ان سے چند حدیث کو جو ہو " لوگوں کے امام پر اور امام کے لوگوں پر حقوق " سے متعلق ہیں، یہاں نقل کرتے ہیں حضرت علیؑ نے لوگوں سے فرمایا، ہم اور تم ایک دوسرے پر کچھ حقوق رکھتے ہیں میرے حقوق تم پر یہ ہیں کہ تم لوگ۔

۱۔ اپنے عہد و پیمان پر باقی اور وفادار رہو۔ ـــــ الوفاء بالبیعة

۲۔ حضور و غیاب میں خیر خواہ رہو۔ ـــ والنصیحة فی المشهد والمغیب

۳۔ ہر وقت جب کبھی بھی میں تمہیں طلب کروں چلے آو۔ ـــــ والاجابة حین ادعوکم و ... (بحار جلد ۲۷ صفحہ ۱۵۱)

اور تم لوگوں کے حقوق مجھ پر یہ ہیں کہ:

۱۔ خیر خواہی اور دلسوزی۔ ۲۔ تامین ضروریات اوران کا حساب و کتاب۔

۳۔ تعلیم و تربیت۔

دوسری حدیث میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا، " ولکم علی من الحق مثل الذی لی علیکم " جس قدر تم لوگوں کے حقوق مجھ پر بنتے ہیں اسی قدر میں بھی تم لوگوں پر حق رکھتا ہوں۔[۱]

اس کے بعد امام اپنے اس جملہ کی وضاحت یوں فرماتے ہیں کہ بزرگترین جو حق خدا نے لوگوں پر واجب کیا ہے وہ وہی متقابل حقوق، رہبر کے لوگوں پر اور لوگوں کے رہبر پر ہیں۔

حضرت امام زین العابدینؑ اپنے رسالہ حقوق کے شروع میں حق امام کو واجب ترین حقوق بیان کرتے ہیں، " واوجبها علیک حب انتهک " حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔ جیسے تم لوگ جباروں اور طاغوتیوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہو ویسے میرے ساتھ گفتگو نہ کیا کرو اور نہ ہی میرے ساتھ پھونک پھونک کے قدم رکھو اور نہ تکلف و رعایت سے میرے ساتھ پیش آؤ۔ اور کبھی خیال نہ کرنا کہ تمہارے تذکرات مجھ پر بار گزریں گے۔ جہاں بھی کوئی حق بات یا مشورہ قابل ذکر دیکھو مجھے آگاہ کردو (اس لئے کہ) اگر خدا حفاظت نہ کرے تو ہم بھی خطاؤں سے محفوظ نہ رہیں[۲]۔ اسلام نے امام کے شرائط و صفات میں زیادہ وقت سے کام لیا ہے لیکن جب امام کی تعیین اور شناخت ہوجائے تو اس وقت اطاعت امام کو مسلم واجبات میں شمار کیا ہے۔[۳]

۱۔ بحار جلد ۲۷/ صفحہ ۲۵۱

۲۔ بحار جلد ۲۷/ ۲۵۳

۳۔ اصول کافی میں لزوم اطاعت امام کے بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے بحث قضاوت میں لوگوں کو فقہاء کی طرف رجوع کرنے کیلئے تاکید کی ہے اور آخر حدیث میں فرماتے ہیں کہ جو شخص فتویٰ اور ان فقہاء کی قضاوت و فیصلہ کو رد کردے اس نے گویا ہم کو رد کر دیا ہے اور جس نے ہم کو رد کر دیا اس نے خدا کے ساتھ شرک کیا ہے (اصول کافی / باب اختلاف الحدیث)۔

دوسری حدیث میں وارد ہے کہ اگر کوئی شخص راتوں کو نمازیں پڑھے اور دن کو روزے رکھے، ہر سال مکہ حج کرنے جائے اور اپنا تمام مال راہ خدا میں خرچ کرے لیکن ولی خدا کو نہ پہچانے اور اپنے کاموں کو اس کی رہبری کے مطابق انجام نہ دے تو وہ شخص خدا پر اپنا کوئی حق نہیں رکھتا ہے (سفینۃ البحار مادہ (ولی)۔

امت کی ذمہ داریاں

ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ لوگ اپنے امام معصوم کے سلسلہ میں تین ذمہ داریاں رکھتے ہیں،

۱۔ اپنے امام کو پہچاننا ان روشن دلائل اور ممتاز صفات کے ذریعہ کہ جو ایک امام معصوم کو رکھنا چاہئے۔

۲۔ ان بزرگواروں کے حکم پر سر تسلیم خم کرنا اس طرح کہ ان کی باتوں کو دل سے قبول کرے۔

۳۔ (ذاتی) اختلافات میں چاہیے کہ ان بزرگواروں کی طرف رجوع کریں اور ان کو اپنا حاکم و داور قرار دیں۔ (اصول کافی جلد ۲ / باب التسلیم)۔

حج کا اہم ہدف

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ نے ایک نظر کعبہ کے اطراف طواف کرنے والوں پر ڈالی اور فرمایا : یہ کعبہ کے گرد چکر لگانا تو زمانہ جاہلیت میں بھی تھا اسلام آیا تو اس نے طواف و حج کو واجب قرار دیا ۔ تا کہ اس کے وسیلہ سے حج کے دور ان ہمارے گرد جمع ہوں اور ولایت و مودت اور نصرت کا اعلان کریں ۔ اس کے بعد امام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی " فا جعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم ..... "[1]
(ترجمہ ۔ خدایا ! تو تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کرتا کہ وہ یہاں آکر آباد ہوں) اور انھیں طرح طرح کے پھلوں کے ذریعہ روزی عطا کرتا کہ وہ تیرے شکر گذار ہوں)

حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے نہیں چاہا کہ لوگوں کے دلوں کو کعبہ کی طرف مائل کرے بلکہ لوگوں کو اپنی ذریت کہ جو ہی معصوم ذریت ہے کی طرف مائل ہونے کو چاہا ہے ۔"[2]

جی ہاں ! امام کی طرف توجہ کرنا فلسفہ حج میں سے ایک ہے ۔

طرفین (امام و امت) کے تعہدوں پر وفاداری کچھ آثار رکھتی ہے کہ حضرت علیؑ ان کی اس طرح توصیف بیان کرتے ہیں ،

۱۔ ابراہیم / آیت ۳۷

۲۔ اصول کافی / باب رجوع بہ امام بعد از انجام مناسک حج / صفحہ ۳۹۱

۱۔ مہرو محبتوں کا وجود میں آنا " نظاماً لا لفتھم "

۲۔ مکتب کا ہر طرح کے خطرات تحریف ، بدعت اور غلط چیزوں سے محفوظ رہنا " وعزاً لدنھم "

۳۔ باطل چیزوں کا ایک دوسرے کے بعد میدان سے خارج ہونا اور امام سے امت کی اسی محبت والفت کے ذریعہ پاگاہ حق کا محکم و مضبوط ہونا " وعزالحق "

۴۔ دین کی تمام راہوں کا روشن ہوجانا ۔ " وقامت منا هج الدین "

۵۔ عدالت کی بنیادوں کا مضبوط ہو جانا ۔ " لاعتدلت معالم العدل "

۶۔ تمام امور اپنی مجاری (جگہوں) پر قرار پاتے ہیں ۔ " جرت عی اذلالھا "

۷۔ اپنے متقابل حقوق پر امام و امت کی وفاداری حکومتوں کی بقاء اور دشمنوں کے مایوس ہونے کا رمز ہے ، کیونکہ امام و امت ہر ایک قانوں کے مطابق عمل کرتا ہے اور دشمنوں کو نفوذ کی کوئی راہ نہیں دیتا ہے ۔ "طمع فی بقاء الدولة و یست مطامع الا عداء " (بحار جلد ۲۷ صفحہ ۲۵۱)

یہ تمام اثرات امام و امت میں سے ہر ایک کی وفاداری کے نتائج کا ایک گوشہ ہیں جو وہ ایک دوسرے پر رکھتے ہیں۔

تنوری شیعہ

خراسان کے رہنے والے ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق ؑ سے قیام کی پیشنہاد کی کہ آپ تو ایک لاکھ کی تعداد میں مسلح (نوجوانوں) کی طاقت رکھتے ہیں ۔ امام نے خود اس کو آزمانے اور ان لوگوں کی وفاداری کا اندازہ لینے کے لئے اس

شخص سے فرمایا ، آؤ اور اس آگ سے بھرے ہوئے تنور میں کود جاؤ ۔ وہ شخص معذرت کرنے لگا اور کہنے لگا (مولا میں جل جاؤں گا)

اسی اثنا میں مولا کے ایک چاہنے والے نے اسلام کیا، مولا نے اس سے فرمایا : جاؤ اس تنور میں کود جاؤ ۔ وہ شخص گیا اور بڑے اطمنیان سے اس تنور میں کود گیا ۔ امام اس خراسانی شخص کیطرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ، ایسے اشخاص کتنے وہاں ہیں ؟ کہا اب تو ایک بھی نہ ہو گا ۔ جی ہاں دعوی اور عمل یعنی کہنے اور کرنے) میں بڑا فرق ہے ۔ (بحار جلد ۱۱ صفحہ ۵۹ نقل از چہ بہ چہ) البتہ وہ یار فداکار تنور میں نہیں جلا (جیسا کہ جناب ابراھیمؑ آگ میں نہیں جلے تھے)

ایک جھوٹا شیعہ

ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ ، جھوٹ بولتا ہے وہ شخص کا جو دعوی تو کرے کہ میں شیعہ حیدر کرار علی ابن ابی طالبؑ ہوں لیکن اعمال میں دوسروں کی رسیماں پکڑتا ہے ۔" کذب من زعم انه من شیعتنا و هو مستمسک بعروۃ غیرنا "

امامت معصومینؑ کی کیسے تضعیف ہوئی

حضرت امام جعفر صادقؑ سے منسوب ایک حدیث میں ہے کہ اگر بنی امیہ کو ایسے لوگ نہ ملے ہوتے جو ان کے بارے میں لکھتے ، غنائم کی جمع آوری اور ان کی طرف سے جنگ کرتے تو وہ کبھی بھی ہمارا حق نہ لے پاتے ۔ جی ہاں امامت کی تضعیف بے ارادہ محبت کرنے والوں کے تسلیم ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے

ستم بالائے ستم

مظالم

مسئلہ امامت اور مکتب آئمہ طاہرینؑ اور ان بزرگواروں کے سچے چاہنے والوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے۔ میں نہیں جانتا ہو کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں تک اس کا بیان کرنا مفید ہوگا لیکن چونکہ ہم نے فہرست نویسی اور سادہ بیانی کا ارادہ رکھا ہے لہذا اس سلسلہ میں بھی مظالم کے ایک گوشہ کی فہرست بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

اقتصادی ظلم

۱۔ چھین کر کہ جو اس زمانے میں بہت زیادہ در آمد رکھتا تھا حضرت علیؑ سے مالی قدرت و طاقت سلب کر لی۔

تہمتیں

۲۔ ہمارے مظلوم امام حضرت علیؑ پر طرح طرح کی تہمتیں اور الزامات

لگائے گئے. اور حد تو یہ ہے کہ جس وقت شام کے رہنے والوں نے سنا کہ حضرت علیؑ مسجد کوفہ میں شہید کردیئے گئے ہیں. تو انھوں نے کہا، علیؑ مسجد کیا کررہے تھے کیا وہ نماز بھی پڑھتے تھے؟!!!

رقیب تراشی

۳۔ امام کے دشمنوں کو بزرگ اور حضرتؑ کے رقیبوں کو تقویت پہنچاتے گویا اس طرح تضعیف امام کے لئے اسباب پیدا کرتے تھے.

فکری اور فرھنگی ظلم

۴۔ " حسبنا کتاب اللہ " (قرآن بس ہمیں کافی ہے) کا شعار بلند کرکے حضرت رسول خداؐ کی احادیث کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کردیں اور امام معصومؑ کے لبوں پر مہر لگادی اور لوگوں کو علم کے اصلی منابع سے دور کر دیا.

بہی خواہوں کو محروم کرنا

۵۔ ذی القربی اور اہلبیتؑ کا سہم اسلامی محصولات سے ہی حذف کردیا.

جھوٹ باندھنا

۶۔ ابوہریرہ جیسے افراد کے ذریعہ جعلی حدیث کا کارخانہ کھولا گیا. جہاں سے بنی امیہ کی مدح اور بنی ہاشم کو کچلنے کے سلسلہ میں اس قدر جھوٹی حدیثیں اور دوسرے مسائل گھڑے گئے کہ لوگوں کے لئے حق و باطل میں شناخت کی راہیں

مشکل تر بنادیں .

تحریف و توجیہ

۷ ۔ معصوم امام کی رہبری سے متعلق جو روشن اور صریح اقوال تھے ، ان کی توجیہ، تحریف اور ان کو باطل قرار دے دیا گیا.

مسیر عوض کردی گئی

۸ ۔ معصوم رہبری کا مسئلہ کہ جو الہی عہدو پیمان تھا یزید جیسی حکومت کی تک پہونچا دیا گیا.

عالم کی جگہ جاہل

۹ ۔ تمام الہٰی معیار اور اہمیتوں کو لغو قرار دے دیا گیا اور ہر شخص اپنی طاقت کے ذریعہ معاشرہ کو جدھر چاہا لے گیا اور بجائے اس رہبری کے جو پکار رہی تھی (سلونی سلونی) پوچھ لو پوچھ لو جو چاہو پوچھ لو (قبل اس کے کہ تم مجھے اپنے درمیان سے کھو بیٹھو) ایک ایسی رہبری کے پیچھے دوڑ گئے کہ جو چیخ رہی تھی کہ (اقیلونی) مجھے چھوڑ دو مجھے کچھ معلوم نہیں ہے . اور درگاہ علم رسولؐ کے بجائے ایک ایسے شخص کی طرف بھاگے چلے گئے جو بارہا مختلف مسائل میں الجھا اور حضرت علیؑ سے مدد مانگتا رہا ، برابر کہتا تھا کہ اگر علیؑ میری فریاد کو نہ پہنچے اور گڑھوں سے مجھ جیسے پھنسے ہوئے شخص کو نہ نکالتے تو میں کبھی کا ہلاک ہو گیا ہوتا .

کینے اور بہانے

۱۰۔ اس بہانہ سے کہ علیؑ جوان ہیں، پر شوخ ہیں، مسلمانوں کو ان سے جنگ خیبر، بدر، احد اور حنین کی وجہ سے دیرینہ کینہ و حسد تھا کیونکہ حضرتؑ نے آج کے بہت سے مسلمانوں کے کافر آبا واجداد کو جنگوں میں حکم رسولؐ سے قتل کیا تھا، لوگوں کے یہی بہانے اور کینے و حسد باعث بنے کہ امام معصوم خانہ نشین ہو جائیں چنانچہ حضرتؑ کو کسی جگہ کہنا پڑا، "میں روز اول سے ہی مظلوم ہوں" "بحار جلد ۲۷/ صفحہ ۲۰۹"

اور یہ کہ اصحاب رسولؐ میں سے کسی کے لئے بھی حضرت علیؑ کے برابر فضائل نہیں نقل ہوئے ہیں لیکن ان کو ایک طرف ڈال دیا گیا۔" علی ومنا ونوہ"

سچ بتائیں، کیا پر شوخ ہونا مانع لیاقت ہے؟! کیا پیغمبرؐ نے سترہ سالہ حوری رسامہ کو کی نذر نہیں بنایا؟ کیا سن اور کہولت رہبری کے لئے شرط ہے؟! کیا قرآن نے ہمشہ معیار علم، تقوی، جہاد، ہجرت، سابقہ اخلاص اور ایمان کو قرار نہیں دیا ہے؟ کیوں ہم نے الہی معیاروں اور ملاک کے مقابل دوسرے مسائل کو ایجاد کیا ہے؟

امام کی کنارہ کشی

۱۱۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کہتے ہیں امام علمی و معنوی رہبری پر قانع تھے اور سیاسی و نظامی رہبری کو دوسروں کے سپرد کر دیا تھا؟!!!

میں نہیں جانتا ہوں کہ سراسر نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کے نالے و فریاد کیا اس

لئے تھے کہ لوگ آئیں اور امام سے مسائل دریافت کریں ؟ کیا مسائل کا پوچھنا بیعت کا محتاج ہے ؟ دسیوں بار حضرتؑ نے اپنے سیاسی حق کی تضییع پر فریاد کی. اس وجہ سے نہیں کہ کیوں لوگ مجھ سے علمی سوالات نہیں کرتے ہیں علمی سوالات تو انھوں نے امام سے مجبوری کے تحت پوچھے ہیں اور پوچھتے آئے تھے.

کیا امام کو چھوڑنے میں صلاح تھا ؟

۱۲۔ دل میں آگ لگ جاتی ہے جب لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمام لوگ اشتباہ کریں اور امام کو چھوڑدیں اور کسی دوسرے کی طرف چلے جائیں ؟!

ہم اسی سے کہ لوگوں نے امام کو چھوڑ دیا ہے، سمجھتے ہیں کہ ضرور کوئی صلاح ایسی تھی ؟ اس بات کا جواب بھی یہ ہے کہ اولاً تو یہ کہ تمام لوگوں نے حضرت علیؑ کو نہیں چھوڑا تھا. دوسرے یہ کہ کیا اکثریت حقانیت کی دلیل ہے ؟ اگر قرآن کے روشن دلائل ومعیار ہاتھ میں تھے تو ان کو چھوڑ کر لوگوں کے عمل پر نظر ڈالنا چاہیے ؟

گویا سورہ جمعہ کی آخری آیت سے انھوں نے غفلت برتی ہے کہ رسولؐ جمعہ کا خطبہ پڑھنے میں مشغول تھے کہ یکا یک تاجروں کا ایک قافلہ آگیا اور اس نے طبل بجانا شروع کیا. تمام لوگ رسولؐ کو چھوڑ بھاگے اور اس تجارتی قافلہ کے گرد جمع ہوگئے، اتنے لوگوں میں صرف چند لوگ رسولؐ کا خطبہ سنتے رہے. آیا رسولؐ کو چھوڑنے میں بھی کوئی صلاح تھی ؟!

کتنے ظلم ہوئے

ہمارے معصوم امام پر ظلم کی انتہا ہوگئی تھی رحلت رسول اکرمؐ کے وقت کہ جب آنحضرتؐ نے قلم و کاغذ مانگا تو رسولؐ کی توہین کی گئی اور امام کا حق مارا گیا اور یہ مظلومیت اسی طرح حضرت علیؑ کی عمر کے آخری لمحات تک جاری رہی یہاں تک کہ آپ نے ضربت کھاتے وقت فرمایا " فزت ورب الکعبۃ " کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔

مجھے کہنے دیں کہ آج تک حضرت علیؑ کا مقام، پہچانا نہیں گیا ہے حضرتؑ آج بھی مظلوم ہیں۔ ان کی کتاب نہج البلاغہ ابھی تک پہچانی نہیں گئی ہے۔

بنابراین حضرتؑ قید حیات تک ہی مظلوم نہ تھے بلکہ آج بھی مظلوم ہیں۔

جو ظلم ہمارے اماموں پر ہوتے تھے ان کے اسباب کبھی خارج سے تھے اور کبھی نالائق ازواج کی طرف سے تھے، جو ظلم ہمارے اماموں پر ہوتے تھے وہ قابل فریاد بھی نہ تھے کیونکہ اسلامی حکومت کی جڑیں حضرت علیؑ کی فریاد پر اکھڑ جاتیں لہذا صبر کرتے رہے، اس شخص کی مانند جس کی آنکھ میں کانٹا اور گلے میں ہڈی پھنسی ہو۔ جو مظالم ہمارے آئمہ معصومینؑ پر ڈھائے گئے وہ تنہا قلب، زبان، عمل اور قلم سے مربوط نہ تھے بلکہ طرح کے ظلم ڈھائے گئے کہ ان کی وضاحت طویل ہے جو ظلم ہمارے اماموں پر ہوئے وہ مذہب کے نام پر بھی تھے اور تقرب من اللہ کے نام پر بھی، حتی مشبروں سے خطبوں میں۔ نمازوں میں، تنہائی میں اور لوگوں کے سامنے تک برا بھلا کہا گیا!! جو ظلم اماموں پر ہوئے ان میں ایسے ایسے

حربے استعمال کئے گئے کہ جو خود ہمارے اماموں سے سیکھنے گئے تھے، ہمارے اماموں سے ہی علم، مقام اور طاقت حاصل کی گئی اور خود انہی بزرگواروں پر استعمال بھی کی گئی۔

ہمارے اماموں پر ظلم احمق دوستوں کی طرف سے بھی تھا اور دانا دشمنوں کی طرف سے بھی، بزدل دوست بزدل، ڈرپوک، جاہل، بے طرف اور اللہ میاں کی گائے قسم کے تھے لیکن دشمن منافقین زرنگ، چالک مکار اور....

ثقافتی مظالم

میں نہیں جانتا کہ اہلبیت کی بعض مشہور و معروف شخصیتوں نے کہ جو حضرت امام موسی کاظمؑ کی معاصر تھیں کیوں ایک حدیث بھی حضرتؑ سے نقل نہیں کی کیا انھیں کم از کم امام کو ایک معمولی راوی کی طرح حساب نہیں کرنا چاہیے تھا؟ میں نہیں بخاری اپنی اہم ترین کتاب صحیح بخاری میں بعض خوارج سے تو حدیثیں نقل کرتے ہیں اور سو افراد وہ ہیں جو مجہول الحال ہیں ان کی سند کو شرعی اور ان کے کلام کو قابل اعتبار بتاتے ہیں لیکن حضرت امام جعفر صادقؑ اور دوسرے آئمہ معصومینؑ سے ایک حدیث نقل نہیں کرتے ہیں؟!!

ہم سب قبول نہیں کرتے ہیں کہ رسولؐ نے اپنے اہلبیتؑ کو قرآن کے ساتھ قرار دیا ہے؟

؛ اس طرح کے گلے اور شکوے تو بہت ہیں لیکن ہمارا آج کا مسئلہ ان شکووں اور شکایات سے صرف نظر اور اپنے مشترک و اصلی دشمن کے مقابل اتحاد

اور وحدت اسلامی کا پرچم بلند کرنا ہے۔

علمی شکوے اور شکایات تو خود اہلسنت کے درمیان بھی ہیں اور شیعہ دانشوروں کے درمیان بھی اور خود سنی و شیعہ (عوام) کے درمیان بھی لیکن یہ علمی شکوے ہرگز جدائی، اور تفرقوں کا باعث نہ ہونگے کیونکہ تفرقہ کی آگ تمام کو جلا کے رکھ دیتی ہے۔

شیعوں پر مظالم اور تہمتیں

میں نہیں جانتا کہ کیوں لوگوں نے طرح طرح کی تہمتیں لگانے میں اجتناب نہیں کیا ہے؟ جو تہمتیں ہم پر لگائی گئیں ہیں ان کے برخلاف ہم اپنے عقائد نہ تنہا ہزاروں کتابوں کے صفحات میں اور نہ ہی مساجد میں بیان کئے ہیں بلکہ ریڈیو اور ٹیلی وثیرن پر بھی نشر کرتے ہیں کہ خود بندہ ہو ایک معمولی طالب علم کی حیثیت رکھتا ہے، نے بارھا ایران کے ٹیلی وثیرن اور ریڈیو پر (کہ جو پوری دنیا میں سنا جاتا ہے بیان کیا ہے اور اب بھی انہیں ہم قلم بند کرتے ہیں:

"ہرگز شیعہ قرآن کو تحریف شدہ نہیں جانتے ہیں۔

ہرگز شیعہ اپنے اماموں کو خدا تصور نہیں کرتے ہیں۔

ہرگز بہائی اور بابی قومیں شیعوں کا جزء نہیں ہیں۔

ہرگز کوئی ایک شیعہ بھی اپنی کتب معتبر (اصول کافی، تہذیب من لا یحضر الفقیہ اور استبصار) پر عمل کرنا واجب نہیں جانتا ہے بلکہ ان کتابوں کو وہ جمع بندی کے سلسلہ میں

بہتری کتابیں سمجھتا ہے۔ اور نہ یہ کہ جو کچھ ان کتابوں میں ہے وہ ایک سرے سے ہی غیر قابل خدشہ ہے اوران پر عمل کو واجب جانتا ہے۔

ہرگز کوئی ایک شیعہ بھی تمام اصحاب رسولؐ کو مرتد نہیں جانتا ہے بلکہ عقیدہ رکھتا ہے کہ جس طرح زمانہ رسولؐ میں مومن واقعی بھی تھے اور منافق بھی اور رحلت رسول اللہؐ نے منافقین کو مومن نہیں بنادیا ہے۔ بنابراین جو لوگ کہتے ہیں کہ رسول خداؐ کے تمام اصحاب مومن واقعیاور عادل ہیں وہ یہ بتائیں کہ جو لوگ حیات رسولؐ میں منافق تھے وہ رحلت رسولؐ کے بعد کہاں چلے گئے

کیا اکثر لوگ حق کو چھوڑ سکتے ہیں ؟

جو لوگ قرآن کی ثقافت سے آشنا ہیں جانتے ہیں کہ لوگوں نے کیسے دو بزرگ پیغمبروں جناب ہارونؑ اور ان کے بھائی جناب موسیٰؑ کو چھوڑ دیا اور ایک گوسالہ کے اطراف جمع ہوگئے۔ جی ہاں جب تک ہوس، جنسی اور فطری تقاضے اورشیطان وسوسے موجود ہیں ہر طرح کے خطرات ممکن ہیں۔

اس قدر نمازوں اور جہاد کے باوجود کیسے منحرف ہو سکتے ہیں ؟

قرآن نے اسکا جواب دیا ہے کیونکہ قرآن عبادت نہیں چاہتا ہے بلکہ عبودیت چاہتا ہے ابلیس نے ہزاروں سال عبادتیں کیں لیکن جیسے ہی عبودیت کے مرحلہ تک پہنچا بہک گیا ہم کو قرآن میں نابودی عمل کا مسئلہ ملتا ہے کہ کیسے عمل ضائع ہو جاتے ہیں) کیا بلعم باعورا نام کے ایک شخص پر خدا کا خاص لطف نہیں ہوا لیکن کیسے غضب کا مستحق قرار پایا یقیناً سوی عاقبت کا مسئلہ انسان کیلئے ایک اہم ترین خطرہ ہے کہ جو سب کو تہدید کرتا ہے لیکن دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کنویں میں پھینکے گئے ۔زندان گئے ، اور غلام بنائے گئے لیکن کسی بھی موقع خطرہ کا احساس نہیں کیا اور جیسے ہی مقام و ریاست پر پہنچے ، دعا کی کہ خدایا ! مجھے مسلمان اٹھانا اور (حق سے) منحرف نہ کرنا (توفنی مسلماً) لہذا معلوم ہوا کہ نتیجہ کار اہم ہے . جناب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ، میری نظر میں اساسی چیز اجر آخر ہے نہ کہ اجر اول .

شیعہ اور سنی نظرے

اگر آپ شیعہ اور اہلسنت کی کتابوں کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں تو آپ مشاہدہ کریں گے کہ تقریباً وہ تمام فضائل کہ جو شیعوں نے حضرت علیؑ کے بارے میں لکھے ہیں سنی علماء نے بھی ان کو نقل کیا ہے اور اگر کسی جگہ شیعوں نے بعض اصحاب کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے تو وہ تنقید یں اہلسنت کی کتابوں میں بھی مشاہدہ

کی جاسکتی ہیں۔

کہ بعض لوگ شیعوں کو دور سے دیکھتے ہیں اور فیصلہ کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ایران کے سفر پر آئیں اور دیکھیں کہ بہت سے شہروں میں دونوں شیعہ اور سنی بھائی کیسے مل کر کام، ہمکاری، شادیاں، معاملات، مسافرت کارخانے اور ادارے چلا رہے ہیں حتی ایک دوسرے کی نماز جماعت میں شرکت کرتے ہیں۔ اور کبھی بھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا ہے۔ تو ان کو معلوم ہوگا کہ اگر دوسرے ممالک میں بعض نا تجربہ کار یا بدخواہ متعصب علماء نے ایک طرف سے شیعوں پر جو تہمتیں لگائی ہیں وہ تنہا فساد پر برپا کرنے کے لئے تھیں ورنہ شیعوں کا یہ فرقہ سیاسی ہے اور نہ ہی بعض دینی مطالب کا منکر اور نہ ایرانیوں کا بنایا ہوا ہے اور نہ ہی صفویہ کا اور نہ .... بلکہ شیعہ وہی مسلمان ہیں جو خود زمانہ رسولؐ میں حضرت علیؑ کے چاہنے والے تھے اور خود رسول خداؐ نے یہ لقب حضرت علیؑ کے پیروکاروں کو عطا کیا تھا [1] اور قرآن و اسلام کے پیرو ہیں اور ان کا ہدف خدا کی رضا ہے۔

۱۔ الغدیر جلد ۲/ صفحہ ۵۷

صحیح اور غلط رہبری

قرآن میں مسئلہ رہبری پر زیادہ توجہ دی گئی ہے مثبت پہلو سے بھی اور منفی پہلو سے بھی۔ مثبت پہلو میں رسولؐ اور اولی الامر کی پیروی کو واجب اور خدا کی پیروی و اطاعت کے ساتھ ساتھ اولی الامر کی پیروی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

نیز خدا و رسولؐ اور اولی الامر کی پیروی کے علاوہ جامع الشرائط فقہاء کی پیروی پر بھی تاکید کی گئی ہے اور اگر کوئی شخص ان کا فتوی و حکم کو ٹال دے تو گویا اس نے رسول خداؐ اور امام کے حکم کو رد کردیا ہے جو خدا سے شرک کے مترادف ہے (۱)

برا نہیں ہے کہ ہم یہاں ان لوگوں کو فہرست وار ذکر کریں جن کو امام اور رہبر نہیں ہونا چاہیے اور عوام کو بھی ان کی اطاعت و پیروی نہیں کرنی چاہیے اگر کوئی عاقل انسان زہر آلود فضا اور کسی دباؤ میں نہ ہو تو وہ اسی خدا داد فطرت کے ذریعہ سمجھ جائے گا کہ یہ لوگ رہبری کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں قرآن ایک تنبیہ کرنے والی کتاب ہے اس کو چاہیے کہ خطرات سے بھی ہوشیار کرے لہذا ہم اپنے اعتبار سے کچھ آیتیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ غافل، ہوس پرستوں اور افراط کرنے والے اشخاص کی رہبری قبول کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ "ولا تطع من اغفلنا قلبہٗ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان امرہ فرطا" (۲)

۱۔ وسائل جلد ۱۸/ صفحہ ۹۹

۲۔ سورہ کہف/ آیت ۲۸

(جن لوگوں کے دلوں کو ہم نے (گویا خود اپنے ذکر سے (ان کے فاسد عمل کی بناء پر) غافل کر دیا ہے اور جو (حق کے بجائے) اپنی خواہش نفسانی کے پیچھے ہیں اور (رجوراہ اعتدال و حق سے تجاوز کرتے ہیں بلکہ) جن کا کام ہی سراسر زیادتی ہے (اس طرح کے افراد سے دور رہیں اور ہرگز ان کی پیروی نہ کریں .

۲ ۔ جو لوگ اپنے غرور اور تکبر کی بناء پر حق پر عمل نہیں کرتے ہیں اور حقائق کی تکذیب کرتے ہیں ان کی بھی اطاعت نہ کریں . " ولا تطع المکذبین " [۱]

۳ ۔ جو لوگ بہت قسمیں کھاتے ہیں اور ذلیل ، چغلخور ، مال کے بہت بخیل ، گنہگار اور تندمزاج ہونے کے علاوہ بدذات بھی ہیں اور معاشرہ میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی پیروی ہرگز نہ کریں " ولاتطع کل حلاف مھین " [۲]

۴ ۔ گناہگاروں اور کافروں کی بھی اطاعت سے منع کیا گیا ہے . " لا تطع منھم آثما او کفورا " [۳]

۵ ۔ اسراف اور زیادہ خرچ کرنے والوں سے بھی دوری اختیار کرنی چاہیے . " ولاتطیعوا امر المسرفین " [۴]

---

۱ ۔ سورہ قلم / آیت ۸

۲ ۔ قلم / آیت ۱۰

۳ ۔ انسان / آیت ۲۴

۴ ۔ شعراء / آیت ۱۵۱

۶۔فساد برپاکرنےوالوں کی بھی پیروی نہ کریں ۔" لاتتبع سبیل المفسدین" (اعراف / آیت ۱۴۲)

۷۔جاہلوں کی ہواوہوس کے پیرو کی پیروی نہ کریں " لاتتبع اھواء الذین لایعلمون " (جاثیہ / آیت ۱۸)

۸۔جن لوگوں کا ماضی گمراہی میں گذرا ہے اور آج بھی اپنی ہواوہوس ، فطری تقاضوں اور غرائز میں ملوث ہیں ان کی بھی اتباع نہ کریں[1]

مذکورہ آیات پر پھر ایک بار غور کریں کہ اسراف ، فساد ، جہل برا ماضی ، کفر ، معصیت ، گناہ ، ذلالت و رسوائی اور زیادہ قسموں کا کھانا لوگوں کو رہبری کی صلاحیت سےکیسے دور کر دیتا ہے اور بخوبی سمجھ میں آتا ہےکہ امام اور رہبر کو مذکورہ تمام عیوب و غیرہ سے پاک ہونا چاہیے اور دوسری آیتوں میں یہود و نصاری کی مسلمانوں پر ولایت اور دشمنان خدا کا نفوذ اور سر پرستی کرنا اور اسی طرح ان نمایاں مسلمانوں کی ولایت سے منع کیا گیا ہے کہ جو (اسلامی ثقافت و) مکتب کو بہانہ اور اپنی دستاویز قرار دیتے ہیں.[2]

اولی الامر کون ہیں ؟

قرآن میں ارشادہے:" اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" سورہ نساء / آیت ۵۹ (خدا و رسولؐ اور صاحبان امر کی اطاعت کرو)

۱۔ "لاتتبعوا اھواء قوم قد ضلوامن قبل..." مائدہ / آیت ۷۷)

۲۔ مائدہ / آیت ۵۷ و سورہ ممتحنہ / آیت ۱

آیا یہ صاحبان امر کہ جو خدا و رسولؐ کے ساتھ ساتھ ذکر ہوئے ہیں ان کا کام خداو رسولؐ کی روش پر نہیں ہونا چاہیے ؟

آیا صحیح ہے کہ ایک ہی جملے میں تاکید کرے کہ خدا و رسولؐ کا پیروکار رہو اور ہرگز اس کے خلاف عمل نہیں کرو لیکن فوری طور پر تاکید کرے کہ ایسے صاحبان امر کی پیروی کرو جو ہر روز ہزاروں خلاف کرتا ہو آیا یہ تناقض ایک ہی جملہ میں صحیح ہے ؟!

اولی الامر وہی معصوم امام ہونے چاہئے کہ ان بزرگواروں کی اطاعت بھی وہی خدا ورسولؐ کی اطاعت اور کسی طرح کا فکری و علمی انحراف ان کے یہاں نہیں پایا جاتا ہو اور عصمت کی منزل پر پہونچ ہوں .

اگر اولی الامر سے مراد کوئی غیر معصوم ہو تو حق یہ تھا کہ اس طرح کی پیروی کا حکم مطلق اور عمومی نہیں ہونا چاہیے بلکہ والدین کی پیروی کے مانند مشروط ہونا چاہئے ، یعنی یہ کہ لوگوں کو تاکید کی گئی ہو کہ اپنے والدین کی اطاعت اور ان کی نسبت احسان کریں لیکن ہر جگہ اطاعت واجب نہیں ہے کیونکہ اگر والدین چاہیں کہ اپنے فرزند کو توحید کے دائرہ سے خارج کردیں تو اس صورت میں ان کی اطاعت واجب نہیں ہے ، " وان جاهداک لتشرک بی مالیس لک به علم فلا تطعهما "[1]

۱۔ عنکبوت / آیت ۸ ولقمان / آیت ۱۵

(اگر تجھے تیرے ماں باپ اس بات پر مجبور کریں کہ ایسی چیز کو میرا شریک بنا کہ جس کا تجھے کوئی علم بھی نہیں تو ان کی اطاعت نہ کرنا) توجہ کریں کہ والدین کی اطاعت ہر جگہ نہیں ہے بلکہ ان صورتوں میں اطاعت ہے کہ جب تک وہ اپنے فرزند کو انحراف کی طرف نہ کھینچیں لیکن اولی الامر کی اطاعت کس قید و شرط کے بغیر مطلق ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اولی الامر قرآن کی نظر میں ہر طرح کی قید و شرط سے بے نیاز ہیں. وہ لوگ ایسے ہیں کہ ان بزرگواروں کا منحرف ہونا یا کرنا عملاً محال ہے.

بنابراین قرآن میں اولی الامر سے مراد وہی معصوم پیشوا ہیں اور جن سو (۳۰۰) حدیثوں کے مطابق کہ جنھیں شیعہ و سنی دونوں فریقوں نے نقل کیا ہے بارہ (۱۲) افراد ہیں.[1]

۱۔ حضرت آیت اللہ لطف اللہ صافی اپنی کتاب "جلاء البصر" میں فرماتے ہیں کہ شیعہ و سنی دونوں نے جن (۳۰۰) سو حدیثیں نقل کی ہیں کہ رسولؐ کے بعد اماموں کی تعداد بارہ ہے.

ولایت فقیہ ، راہ امامت کا ایک سلسلہ

ولایت فقیہ

سیکڑوں مسلم حدیثوں کے مطابق کہ جو رسولؐ کے بزرگترین اصحاب سے نقل ہوئی ہیں معصوم اماموں کی تعداد بارہ ہے کہ ان بزرگواروں میں سے گیارہ کو یا زہر دیا گیا یا انکو شہید کر دیا گیا ہے اور یہ سب انھیں اپنے زمانے کے طاغوتوں کے خلاف جدوجہد کرنے کی وجہ سے ہوا .

ہمارے حضرت مہدی علیہ السلام غائب ہیں اور بہت سی معتبر حدیثوں کے مطابق ایک عدالت جہانی کی حکومت تشکیل دینے کے لئے ظہور کریں گے .

چونکہ لوگ آپؑ کی رہبری قبول کرنے کی امادگی نہیں رکھتے ہیں اس وجہ سے خدا نے آپؑ کو ایک مناسب وقت کے لئے محفوظ کیا ہے چونکہ حکومتوں نے گیارہ چراغ گل کردیئے ہیں ، لہذا خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ بارہویں چراغ کو نہ گل کر سکیں . اور وہ اپنے چراغ کو اس وقت تک چھپاکے رکھے گا جب تک معاشرہ ایک ایسے تمدن و رشد کو نہ پہونچ جائے . کہ وہ نور کو درک کرسکے اور اس سے

بہرہ مند ہو سکے.

خدا نے گیارہ معصوم اماموں کو بھیجا لیکن لوگوں نے ان بزرگواروں کو شکنجوں زندانوں اور تلواروں کے ذریعہ قتل کرڈالا لہذا بارھویں امام کو ایک مناسب وقت کیلئے خدا نے محفوظ کرلیا. دوسری طرف زمانہ غیبت میں ہم کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا بلکہ ہم کو باتقوی اور عادل فقہاء اسلام کے سپرد کیا اور اس سلسلہ میں بہت تاکید کی.

بنابراین ہم تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے اسلامی نظام کی حفاظت کریں اور حوادث میں فقیہ عادل کی زبانی خدا کے حکم کی تعمیل کریں.

ولایت فقیہ کا کردار، امامت کا کردار ہے

ولایت فقیہ کا کردار وہی امامت کا کردار ہے اور راہ انبیاءؑ ہے. اسلام میں کچھ قوانین، مالیات، اقتصاد، نظام، جزاء، اور قضاوت کے مسائل سے متعلق ہیں کہ جسے اسلام نہ تو انہیں روکنا چاہتا ہے. اور نہ ہی ان کا اختیار کسی جاہل اور خود غرض افراد کے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے اور نہ ہی کسی خاص طبقہ کو لوگوں پر مسلط ہونے کی اجازت دینا چاہتا ہے. بلکہ اس نے قوان کے اجراء کا کام باتقوی اور اسلام شناس عادل فقہاء کے ہاتھوں میں دیا ہے تاکہ وہ تمام مسائل و حوادث میں خدا کے قانون کے مطابق حکم کریں اور لوگوں پر ان کی اطاعت، خدا و رسولؐ اور امام معصومؑ کی اطاعت کی طرح واجب قرار دیا ہے.

ولایت فقیہ اور اس کا کردار

سچ بتائیں ؛ مسلمانوں کو نظام کی ضرورت ہے یا نہیں ، کیا اسلامی ملک کی حفاظت ہونی چاہیے یا نہیں ، اس کی سرحدوں کی حفاظت ہونی چاہیے یا نہیں ؟ اسلامی ممالک میں قوانین اجراء ہونے چاہیے یا نہیں آیا مظلوموں کا حق ظالم افراد سے لینا چاہئے یا نہیں ؟ آیا صدائے اسلام پوری دنیا میں پھیلائی جانی چاہئے . یا نہیں اور کیا ہمارے انبیاءؑ واماموں کی کوشش اور محنتیں تنہا خود انھیں بزرگواروں کے زمانے سے مخصوص تھیں یا ہر زمانے اور خطہ و ارض سے .

اگر جواب مثبت ہے اور اسلام معاشرہ ، قانون اور کوئی نظام رکھتا ہے اور حقوق اور سرحدوں کی حفاظت کرنا مقصود ہے تو اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے اس لئے کہ ایک دقیق اور منظم تشکیلات کے بغیر خصوصاً ہمارے اس زمانے میں جب اسلام کے مخالفین ایک بہت بڑی اور دقیق تشکیلات کے مالک ہیں ، کبھی بھی ہم اپنی جان و مال ، عزت و آبرو ، قوانین و مکتب اور سرحدوں کی حفاظت اور دفاع نہیں کر سکتے ہیں اور اگر حکومت ضروری ہے تو حاکم کا ہونا بھی ضروری ہے اس لئے کہ حکومت حاکم کے بغیر محال ہے .

اب جب اسلام اپنے اجراء قوانین کے لئے حکومت کا بھی محتاج ہے اور حاکم کا بھی تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ حاکم کن شرائط کا مالک آیا حکم خدا کو اس کی تمام گہرائیوں کے ساتھ جانتا ہو یا نہیں ؟ عادل ہو یا نہیں کسی مسائل و حوادث کے بارے میں آشنائی اور بصیرت رکھتا ہو یا نہیں ؟

اگر بناء یہ ہے کہ حاکم کو ایک اسلام شناس ، با تقویٰ اور سیاست دان ہونا چاہیے تو یہ وہی ہے کہ جن کا نام ہم نے ولایت فقیہ رکھا ہے .

جو لوگ ولایت فقیہ کو قبول نہیں کرتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ مندرجہ ذیل نظریوں میں سے کسی ایک کو قبول کریں ،

۱ ۔ یا تو وہ قائل ہوں کہ ، اسلام فقط نماز ، روزہ اور ایک طرح کی انفرادی عبادات و اخلاقیات کا نام ہے اور بس ، اور ، اجتماعی ، حقوقی ، عدالتی ، اقتصادی اور سیاسی جیسے اہم مسائل اس میں نہیں پائے جاتے ہیں .

۲ ۔ یا قائل ہوں کہ ، اسلام تنہا زمانہ رسولؐ سے مخصوص تھا . اس کہ بعد چھوڑ دیا گیا ہے اور ان کے مہم اجتماعی قوانین کی جگہ فقط کتابیں رہ گئی ہیں .

۳ ۔ یا قائل ہوں کہ ، اسلام کے مہم ترین اجتماعی قوانین جاہل و فاسق کے ہاتھوں اجراء ہوں .

اگر مذکورہ بالا نظریات میں سے کوئی ایک بھی قابل قبول نہیں ہے تو پھر اسی ولایت فقیہ کو قبول کریں جس کے ذریعہ خدا کے احکام ، باتقویٰ ، اسلام شناس اور روزانہ کے مسائل و حوادث سے آشنا فقہاء کے ذریعہ اجراء ہوں .

ہمیں یقین ہے کہ اس معنی میں کسی کو بھی ولایت فقیہ ، حکومت اور باتقویٰ اسلام شناس افراد کی نظارت قابل انکار نہ ہوگی .

کیا اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول نہیں ہے کہ قرآن میں معاشرہ کی تمام انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور کیا

حکومت ، حاکم اور نظام و مشکلات ایک معاشرہ کی مہمترین ضرورتوں میں سے نہیں ہے (اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۹)

حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے : " خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میں دنیا سے نہیں جارہا ہوں مگر اس کے بعد کہ میں امت کی تمام ضرورتوں کو بیان کر چکا ہوں" آیا اسلامی معاشرہ ، حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانہ غیبت میں حکومت و حاکم کا محتاج نہیں ہے ؟! (۱)

حضرت امام رضاؑ اپنی کسی گفتگو کے ضمن میں مسئلہ رہبری کے بارے میں فرماتے ہیں ، " کوئی ملت و امت ایسی نہیں ہے جو رہبر نہ رکھتی ہو ، ایک معاشرے کا قیام ایک رہبر کے وجود سے وابستہ ہے تا کہ اس کے حکم سے بیت المال میں سال جمع اور تقسیم بھی ہو اور دشمنان خدا کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے بھی ہوں . اور لوگوں کو منظم بھی کرے اور تفرقہ سے بچائے بھی اور اگر کوئی معاشرہ ایسے رہبر سے محروم ہو تو معاشرہ ، بکھر جائے گا اور خدا کے قوانین ، الٰہی احکام اور رسول خداؐ کے دستورات بدل جائیں گے . (بحار جلد ۲ صفحہ ۴۰)

توجہ کیا آپ نے کہ حضرت امام رضاؑ کے بیان میں حکومت و رہبری کا مسئلہ زندگی کے مہمترین مسائل کے عنوان سے پیش ہوا ہے اور قابل ذکر ہے یہ بات کہ محروم طبقہ کی بھلائی کے لئے مالیات کا وصولی اور منصفانہ تقسیم کے محکمہ کا قیام

۱۔ کتاب البیع ، محرر رہبر انقلاب اسلامی ، حضرت امام خمینیؒ صفحہ ۴۷۳ بنقل از وافی جلد ۱ صفحہ ۵۲۶

مخالفین سے جنگ اور معاشرہ کو عزت و مقام دینا کوئی اہم بات نہیں ہے کہ جو تنہا معصوم اماموں کے زمانہ سے مربوط ہو اور زمانہ غیبت میں معاشرہ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی حاکم و حکومت مذکورہ بالا مسائل کے لئے ضروری نہ ہو۔

اب تک جو بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشرہ کو بھی قبول کیا ہے اور حکومت و حاکم کو بھی۔ لیکن بحث یہ ہے کہ حکومت اور حاکم کے شرائط کا طریقہ کار کیا ہو، اور اس کو کیسا ہونا چاہیے۔

بہت سی روایات اور عقلی دلائل کے مطابق اسلام نے حکومت کا بار ایک فقیہ عادل کے کاندھوں پر رکھا ہے لہذا ہم یہاں ان میں سے بعض روایات کے اہم گوشے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت رسول اکرمؐ نے فقہاء کو اپنا خلیفہ کہا ہے۔[۱]

۲۔ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا، فقہاء اسلام کے قلعے ہیں[۲]

۳۔ حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف نے (اپنے کسی نائب کے نام) خط میں ایک پیغام دیا، اس میں تاکید کی کہ زندگی کے مشکلات اور حوادث میں علماء اور ان دانشوروں کی طرف رجوع کرو جو ہمارے علوم نقل اور بیان کرتے ہیں کیونکہ میں نے ان کو تمہارے درمیان اپنی حجت قرار دیا ہے اور میں خود خدا کی حجت ہوں۔[۳]

۱۔ وسائل جلد ۱۸ صفات قاضی / حدیث ۱۰ / اللھم ارحم خلفائی قیل یا رسول اللہ و من خلفائک ؟ قال الفقہاء۔

۲۔ الفقہاء حصون الاسلام کتاب البیع للامام الخمینی (رہ)۔

۳۔ واما الحوادث الواقعہ فارجعوا فیہا الی رواۃ حدیثنا فانہم حجتی علیکم وانا حجۃ اللہ وسائل جلد ۱۸ باب ۱۱

۴۔ حضرت امام جعفرصادقؑ سے پوچھا گیا کہ اپنے مسائل اور مشکلات حل کرنے کے لئے طاغوتی نظام کے پاس جانا کیسا ہے؟
امام نے فرمایا: ان کے نظام کے پاس لے جانا گویا خود طاغوت کے پاس رجوع کرنا ہے جو کہ ممنوع اور حرام ہے حتی اگر کوئی شخص اپنا مسلم حق طاغوتی نظام کے ذریعہ حاصل کرے تو حرام ہے.... (۱)
بلکہ ان جیسی صورتوں میں تمہارا وظیفہ یہ ہے کہ راہ حل تنہا ان لوگوں سے طلب کرو جو ہماری روایات اور علوم کی نسبت شناخت عمیق رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ میں ان کو تمہارے لئے قاضی کے عنوان سے تعیین کرتا ہوں۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر ان میں سے کسی ایک نے کوئی حکم صادر کیا لیکن تم لوگوں نے اس کو سبک سمجھا تو حقیقت میں تم نے گویا حکم خدا کو سبک سمجھا ہےاور جو شخص ان فقہاء کو رد کرے اس نے گویا ہم کو رد کردیا ہے اور ہمارا رد کرنا خدا کو رد کرنا ہے جو خدائے بزرگ سے شرک کے برابر ہے۔ (وسائل جلد ۱۸ صفات قاضی / صفحہ ۹۹)

۵۔ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: "علماء وارث انبیاءؑ ہیں۔ (وسائل جلد ۱۸ / صفحہ ۵۳)۔

۶۔ خداوند منان نے علماء سے عہدو پیمان لیا ہے کہ وہ ظالم ستمگروں کی شکم سیری، غارت گری اور محروم کی گرسنگی کے مقابل خاموش نہ بیٹھیں گے۔ (نہج البلاغہ / خطبہ شقشقیہ)

۱۔ شاید اس وجہ سے ہے کہ طاغوتی نظام کی طرف رجوع کرنا اس نظام کو قبول اور اس کی تقویت کا باعث نہ ہوجائے

یہ بات واضح ہے کہ معاشرہ میں مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی تشکیلات کی طاقت و محتاج ہے

۷۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں ہمیں قرآن میں بھی تاکید ہے کہ معاشرہ میں عدالت و قسط سے کام لیں، کیا معاشرہ میں عدالت قائم کرنا کسی حاکم و حکومت کے بغیر ممکن ہے؟!!

۸۔ حضرت امام حسینؑ فرماتے ہیں، " احکام اور تمام امور کا اجراء ان باتقوی، خدا شناس علماء کے ہاتھوں انجام پانا چاہیے۔ جو خدا کے حلال و حرام میں خیانت سے کام نہیں لیتے اور امانتوں کے محافظ ہیں۔ (تحف العقول صفحہ ۲۴۲)

۹۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں، " العلماء حکام علی الناس " علماء لوگوں پر حاکم ہیں۔ (غرر الحکم بنقل از الحیاۃ ۲/ ص ۲ و ۳)

پس جو مطالب بیان ہوئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کو تمام امور میں ایک جامع الشرء فقیہ کا پابند ہونا چاہیے کیونکہ حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے زمانہ غیبت میں فقہاء ائمہ معصومین علیہم السلام کی جانب سے رسمی طور پر نمائندے ہیں اور اگر فقہاء سے قدرت و ولایت چھین لی جائے تو الٰہی قوانین عوض اور معاشرہ میں طاغوتیت پھیل جائے گی۔ دور کیوں جائیں اس انقلاب میں ملت ایران کی کامیابی کا اہمترین راز (لوگوں کا) ولایت فقیہ پر خصوصی توجہ کرنا تھا، امام خمینی (رہ) جیسا جامع الشرائط فقیہ حکم دیتا تھا اور لوگ دل و جان سے اس پر عمل کرتے تھے۔

ہمیں یاد ہونا چاہیے کہ آپ نے حکم دیا تھا کہ مٹی کے تیل کا تل بند کردو اور سپاہ اور فوج اپنی چھاؤنیوں سے فرار کرجائیں۔ نقصانات کا جبران سہم امام اور اسلامی مالیات سے کیا جائے اپنے جان و مال کی حفاظت جاری رکھیں۔ تقریریں کرنے کے لئے شہر کی پولیس اور حکومت سے اجازت نہ لیں اور اگر وہ مسجدوں کو بند کردے تو سڑکوں پر عزا داری برپا کریں، اگر وہ میرا فوٹو پھاڑ ڈالیں تو کوئی بات نہیں آرام سے بیٹھیں۔ سادا کیوں (شاہ حکومت کی مخفی پولیس) کو پہچنوائیں۔

کیا یہ شاہ پہلوی خائن کے زمانے میں امام خمینی (رہ) کے احکامات اوران پر لوگوں کی لبیک و پیروی پہلوی حکومت کے سقوط و سرنگونی کی باعث نہیں ہوئی ہے؟!!

ہم نے اب تک ولایت فقیہ کے درخت سے کتنے پھل توڑے ہیں، فقیہ عادل تو حضرت علیؑ اور رسول خداؐ کا نمایندہ ہے (سربلندی اور) پاکیزگی کی دلیل ہے کہ اگر اس کے حکم سے ہمارے جو ان شہید ہوگئے ہیں تو ہمیں دلسرد اور غمگین نہیں ہونا چاہیے۔

سچ بتائیں! کیا دوسری طاقتیں ایسی ہیں کہ جو احکامات جاری کریں اور نتیجہ میں اتنے لوگ شہید ہو جائیں لیکن اس پر ان کے والی و وارث کہیں کہ ہمارے جوانوں کی پوری عمر بھی امام خمینیؒ کی عمر مبارک پر ایک سکنڈ کے لئے نچھا در ہوجائے (تو ہمارے لئے کافی ہے)۔

یہ معنوی کشش اسلام اور اس شخص سے عشق کے علاوہ کہ جس نے اپنی پوری زندگی اسلام پر عمل، تبلیغ اور شناخت کی راہ میں صرف کردی ہو، کسی

دوسرے شخص اور جگہ دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ میں نہیں جانتا ہوں کہ جو لوگ ولایت فقیہ کی مخالفت کرتے ہیں ان کا ہدف کیا ہے؟

کیا وہ اس کے قائل ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت اور نظام کی ضرورت نہیں ہے؟

کیا وہ اس کے قائل ہیں کہ نظام تو ضروری ہے لیکن کسی والی، ناظم اور حاکم کی ضرورت نہیں ہے؟

کیا وہ اس کے قائل ہیں کہ لوگوں کا حاکم ایک غیر اسلام شناس ہو؟

کیا وہ قائل ہیں کہ حاکم ایک فقیہ اور اسلام شناس ہو لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ عدالت و تقوی بھی رکھتا ہو؟

کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ولایت فقیہ کا طبقہ ایک مطلق الغاں قسم کا طبقہ ہے؟

کیا فقیہ ایک خاص طبقہ سے تعلق رکھتا ہے؟

کیا خود خواہی فقیہ سے عدالت سلب ہوجانے کی باعث نہیں ہے کہ اس صورت میں اس کی معاشرہ میں ولایت بھی ختم ہو جائے گی۔

کیا ولایت فقیہ کا قبول کرنا ، طاقت کے متعدد مرکز کا باعث ہے ؟

جب کہ تمام طاقتیں غیر اسلامی اور انحرافی جہت پیدا نہ کریں بلکہ فقیہ عادل کے راستہ سے گذر کر آئیں تو اس صورت میں تمام طاقتیں فقیہ کی جانب سے وجود میں آئیں گی .

بنابراین طاقتیں بھی متعدد نہ ہونگی بلکہ تنہا ایک طاقت ہوگی اور وہ بھی الٰہی اور آسمانی طاقت کہ جو فقیہ عادل کے توسط سے ظہور میں آئے گی.

ہم ولایت فقیہ کے مخالفین سے پوچھتے ہیں کہ اگر آپ امت کا ہاتھ فقیہ اول کے ہاتھوں سے کھینچ لیں تو پھر کس کے ہاتھ میں دیں گے ؟

ہم پوچھتے ہیں کہ اب تک آپ کتنے عادل فقہاء کو جانتے ہیں جو شرق یا غرب سے وابستہ اور وطن فروش ہوں ؟

ہم سوال کرتے ہیں ، ان چند سالوں میں جب سے لوگوں نے ولایت فقیہ کو قبول کیا ہے انھوں نے کونسا نقصاں اٹھایا ہے اور کس چیز سے محروم رہ گئے ہیں ؟

ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کیا اپنے امور میں تقلید نہیں کرنا چاہیے ، کیا تقلید کے موارد فقط عبادت کے مسائل ہیں ؟ کیا ہڑتال ، حفاظت ، مظاہرے ، جنگ ، حساب کتاب ، قرار داد اور نصب و معزول سے متعلق جیسے اجتماعی و سیاسی مسائل میں حلال و حرام کا احتمال نہیں پایا جاتا ہے اور کیا جس موضوع میں بھی حلال و

حرام کا احتمال ہو اس میں ہمیں تقلید نہیں کرنا چاہیے ؟

کیا مسلمان امت کی رہبری کو کسی غیر اسلام شناس کو سونپنا ایسے ہی نہیں ہے جیسے میڈیکل (ہسپتال) کو کسی جاہل آدمی کے سپرد کردیا جائے ؟

کیا امت کو کسی ظالم گنہگار کو سونپنا مقام انسانیت کے ساتھ خیانت نہیں ہے؟

کیا ہم ولایت فقیہ کے وجود کی وجہ سے جوامع بشری میں تمام لوگوں سے سرفراز نہیں ہیں ؟

کیا ہم دنیا کو چیلنج نہیں کرسکتے ہیں کہ تنہا ہماری رہبری کی صلاحیت وہی لوگ رکھتے ہیں جو خاص علم و تقوی سے مزین ہوں ؟

کیا وہ وقت نہیں آگیا ہے جب سیاست دانوں اور موقع سے فائدہ اٹھانے والوں کی غیر منصفانہ رہبری سے نجات پاکر ، اپنے کو اسلام کے دامن میں پناہ اور تنہا اس رہبری کو قبول کریں جو وحی کے معیاروں سے مطابقت رکھتی ہو ؟

میں معذرت چاہتا ہوں کہ بحث تھوڑی طویل ہوگئی لیکن حیف ہے کہ ہم امامت پر کتابچہ تو لکھیں سکیں حضرت امام مہدی ارواحنالہ الفداء کے زمانہ غیبت میں معاشرہ کی رہبری و امامت کے بارے میں کچھ نہ لکھیں (آخر میں) خداوند متعال سے تمام لوگوں کے لئے اخلاص و برکت کا خواہاں ہوں .

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ .

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علی سیدنا محمد و اہل بیتہ و لعنۃ اللہ علی اعدائھم اجمعین

عدل الٰہی

ہم توحید کی بحث میں الٰہی مکتب فکر اور توحید و شرک کے مسئلے کو بطور خلاصہ بیان کر چکے ہیں اب ہم اپنے اعتقاد کی دوسری قسم (عدل) کو بیان کریں گے۔

ہم خداوند عالم کی عطا کردہ عقل کی طاقت کے ذریعہ اچھائیوں اور برائیوں کو محسوس کرتے ہیں ، اور اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ ظلم و ستم بری چیز ہے اور عدالت اچھی چیز ہے اور اس بات کے معتقد ہیں کہ خدا قبیح اور برا کام نہیں کرتا ظلم و ستم اس میں ہرگز نہیں ہے کیونکہ تمام مظالم جو ہم انسان کے اندر مشاہدہ کرتے ہیں ان کا سر چشمہ مندرجہ ذیل امور میں سے کوئی ایک ضرور ہوتا ہے۔

۱۔ جہالت :- کبھی جہالت اور نادانی ظلم کی جڑ ہوتی ہے ، مثال کے طور پر

انسان نہیں جانتا کہ سفید فام اور سیاہ فام آپس میں کوئی فرق نہیں رکھتے ، لیکن سفید فام برتری کے تصور اور خیال سے ، سیاہ فام پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے . اس ظلم کی جڑ جہالت یا خود خواہی ہے لہذا ممکن ہے کہ انسان گھٹیا قسم کے تصورات و خیالات و انحرافات اور جہالت و کم علمی کی بنا پر ایسے کام انجام دے جن کا نتیجہ ظلم و ستم کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن وہ خدا جس کے یہاں جہل کا گذر نہیں اور جس کا علم بے پایان ہے ، اس سے کیسے ممکن ہے کہ ظلم سرزد ہو .

۲:- خوف :- کبھی ظلم کا باعث خوف ہوتا ہے ، مثلاً ایک طاقت اپنی حریف طاقت سے خوفزدہ ہوتی اور ڈرتی ہے کہ اگر وہ حملہ نہ کرے تو اس پر حملہ کیا جائیگا . لہذا حفظ ماتقدم اور حملہ کی روک تھام کی غرض سے دوسری طاقت پر ظلم کرتی ہے . یا مثلاً طاغوتی طاقتیں اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کی غرض سے اور آزادی خواہوں پر کنٹرول حاصل کرنے کی خاطر ظلم و ستم کا سہارا لیتی ہیں ، لیکن کیا خدا کا بھی کوئی حریف اور مدّ مقابل ہے یا خدا اپنی حکومت اور قدرت کو مضبوط بنانے کا محتاج ہے ؟

۳:- ضرورت اور کمی :- کبھی ضرورت اور نیاز ظلم کی عامل ہے . ممکن ہے مادی یا روحی ضروریات کسی کو مجبور کریں تا کہ وہ کوئی قبیح عمل انجام دے اور دوسرے پر ظلم و ستم کرے .

۴:- ممکن ہے بعض مظالم انسانوں کی اندرونی خباثت کی وجہ سے ہوں :- بعض کی یہ عادت ہے کہ وہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے اور یا ان کو تکلیف

میں مبتلا دیکھ کر لذت محسوس کرتے ہیں۔

اب جبکہ آپ ظلم کی جڑوں اور سرچشموں سے واقف ہو گئے ان میں سے کون سے امور خداوند میں پائے جاتے ہیں جو اس میں ظلم کا باعث قرار پائیں؟ قرآن اس سلسلے میں فرماتا ہے "وماالله یرید ظلماً للعالمین" (آل عمران ۔) خداوند کسی بھی موجود کی نسبت ظلم کا ارادہ بھی نہیں رکھتا ہے۔

وہ خدا جو ہم میں عدالت کا حکم دیتا ہے " ان الله یامر بالعدل والاحسان " (نحل / ۹۰) کیسے ممکن ہے کہ وہ خود ظلم کرے؟ کیسے ممکن ہے کہ خداوند کمزور انسان کو حکم دے جو سرکش غرائز و جذبات کے طوفان میں گھرا ہوا ہے ایک قوم کی جانب سے مشکلات اور عداوتوں میں گھرا ہے، اس کو تو عدالت کا حکم دے کہ یہ تمام باتیں اس کی بے انصافی کا سبب نہیں ہونی چاہیے۔ " ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلوا " (مائدہ / ۸) لیکن خود اپنی بے نہایت قدرت کے باوجود جو کسی قسم کے غریزہ و جذبہ سے متاثر نہیں ظلم کرے؟!

خدا کے صفات سے متعلق ہماری شناخت

خداوندعالم کے صفات کے متعلق شناخت کی راہ خود خداوند کی شناخت کے مانند ہے۔

مثلاً جس طریقہ سے آپ تحریر سے لکھنے والے کو پہچانتے ہیں اور لکھنے والے کے خط اور تحریر کی حالت سے بھی باخبر ہوتے ہیں، اس کے کلمات سے آپ بخوبی

سمجھتے ہیں کہ لغات کے بارے میں اس کی معلومات کتنی ہے، اس کے مضمون کے ذریعہ اس کی تحریر کی قدرت کو سمجھتے ہیں، اس کے مطالب سے آپ لکھنے والے کے مقصد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں پس ہر بنانے و پیدا کرنے والا، دو کام انجام دے سکتا ہے۔

۱۔ اپنی ایجاد کو پہچنوائے۔

۲۔ اپنی ایجاد کے مقصد وحالات اور صفات کو سمجھائے [۱]

۱۔ البتہ باقی تمام صفات جو خدا کیلئے ہیں قدرت اور علم کے مانند نہیں ہیں خدا کی صفات کی دو قسمیں ہیں۔

الف۔ وہ صفات جو اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں مانند علم و قدرت و حیات۔

ب۔ وہ صفات جو اس سے جدا ہو سکتے ہیں جیسے خالق ہونا کیونکہ یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ خدا ہو لیکن خلق نہ کرے لیکن یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ خدا ہو لیکن علم و قدرت نہ رکھتا ہو۔ البتہ خدا ہر کام کرنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن حکمت کے خلاف کام نہیں کرتا ہے مثلاً ہم خود کو اندھا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں لیکن ایسا نہیں کرتے ہیں کیونکہ یہ عمل حکیمانہ نہیں ہے، پس قدرت ہے لیکن اس سے استفادہ اسی وقت میسّر ہے جب عمل عدل و حکمت اور گذشتہ وعدوں سے ہم آہنگ ہو اور وہ خدا جس نے وعدہ کیا ہے کہ مؤمنوں کو بہشت اور فاسقوں کو جہنم میں بھیجے گا۔ اب اگر اپنے وعدے کے خلاف کرے تو یہ وعدہ خلافی ہوتی ہے اور یہ عمل قبیح ہے، اور خدا ہرگز اپنی قدرت کے ذریعہ سے برا کام نہیں کرتا ہم جو کہتے ہیں کہ خدا ظلم نہیں کرتا ہم نے اس کی قدرت کو محدود نہیں کیا ہے بلکہ یہ عین حکمت ہے جو اس بات کا موجب بنتی ہے کہ قدرت کو مناسب جگہ میں استعمال کیا جائے۔

عدل کو ہم اصول دین سے کیوں سمجھتے ہیں ؟

باوجود اس کے ، کہ خداوندعالم کے صفات بہت زیادہ ہیں جیسے حکمت ، قدرت ، خالقیت ، علم و ..... ، یہ کیوں کہتے ہیں کہ عدالت اصول دین سے ہے ؟ اور یہ کیوں نہیں کہتے کہ اول توحید دوسرے حیات ، یا اول توحید دوسرے علم ، بلکہ ان سب کی جگہ یہ کہتے ہیں کہ اول توحید دوسرے عدل ؟

جواب :۔ کیونکہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا طبقہ (فرقہ اشعری) خدا کے عادل ہونے کو ضروری نہیں سمجھتا ، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جو کام خدا چاہے اور جو انجام دے وہی درست ہے ، اگرچہ وہ کام ہماری عقل کے نزدیک ایسے ہوں جو مسلما قبیح ، برے اور ظلم پر مبنی ہیں ؛ مثلاً وہ کہتے ہیں اگر خداوند عالم ـــــ کسی مقتول ـــ کو دوزخ اور ان کے قاتل ـــــ کو جنت میں بھیجے تو اس کے لیے کوئی چیز مانع نہیں ہے لیکن ہم اس منطق کو قبول نہیں کرتے اور خدا کی عدالت کو اپنے اصول عقائد کا جزو سمجھتے ہیں اور ہم منطق عقل اور آیات قرآن کے مطابق کہتے ہیں کہ خدا کے تمام کام حکمت اور عقل سے انجام پاتے ہیں

اور اس کے تمام کام حکیمانہ ہیں ، اس سے ایسا کام سرزد نہیں ہو سکتا جو ظلم پر مبنی اور قبیح ہو . اس کے علاوہ خداوند عالم کی عدالت پر ایمان رکھنا مختلف جہات سے انسان کی زندگی کی تعمیر میں ایک عجیب اثر رکھتا ہے .

۱ ۔ گناہوں کے مقابلہ میں خود کو کنٹرول کرنا ، کیونکہ جب انسان یہ جان لے کہ اس کی گفتار اور کردار خدا کے زیر نظر ہے اور وہ ذرہ برابر بھی اس کے اعمال کے متعلق غفلت نہیں کرتا ہے . اور وہ ہر کام کی جزاء یا سزا پائے گا . لہذا اپنے آپ کو اس دنیا میں بغیر کسی قید و شرط کے آزاد تصور نہیں کرتا (اس سلسلے میں قرآن کریم میں متعدد آیات موجود ہیں)

۲ ۔ عدل الٰہی کا معتقد انسان نظام تخلیق کے ، متعلق خوش بین ہوتا ہے کیونکہ وہ خداوند عالم کو عادل سمجھتا ہے لہذا تلخ حوادث اس کے لیے شیریں ہیں اور ایسا شخص کسی حال میں بھی کبیدہ خاطر اور مایوس نہیں رہتا ہے .

۳ ۔ عدل الٰہی پر ایمان انسان کی فردی اور اجتماعی زندگی میں عدالت بر قرار ہونے کا محرک بھی ہے ، جو شخص خدا کے عادل ہونے کا معتقد ہے وہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں عدل کو قبول کرنے پر آمادہ ہے .

پہلا نکتہ

عدل کے معنی

بنیادی مسئلہ

عدل کی بحث میں بنیادی مسئلہ ، اعتراضات کا جواب ہے . ہم ان اعتراضات کے جواب میں کبھی روایات اور آیات کی مختصر توضیح کے ہمراہ کچھ دوسرے نکات کو بھی بیان کرینگے .

پہلا نکتہ :- عدل کے معنی ، خدا عادل ہے یعنی وہ کسی مخلوق کے حق کو پامال نہیں کرتا ہے ، وہ ہر موجود کے ساتھ کائنات کے حکیمانہ نظام کے مطابق لطف کرتا ہے ، اور حقوق کا پامال کرنا ظلم ہے . پس عدل اور ظلم وہاں ہے جہاں کوئی حق مدّ نظر ہو .

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا کوئی شخص خدا سے کسی چیز کا مطالبہ رکھتا ہے اور موجودات کا پہلے سے کوئی حق تھا جو پامال ہوا اور کوئی ظلم وجود میں آیا ؟ کیا ہم پہلے سے موجود تھے یا ہماری کوئی چیز موجود تھی جو چھن گئی ہو ، یا پامال ہو گئی ہو ؟ البتہ دنیا کے موجودات میں بہت سے فرق ہیں ، ایک جماد کی شکل میں ہے ، ایک نباتات اور گیاہ ، ایک حیوان اور ایک انسان کی شکل میں ہے لیکن کوئی بھی موجود

و مخلوق پہلے سے کوئی حق اور وجود نہ رکھتی تھی. جس سے اس کو روکا گیا ہو، مثلاً ایک بڑی قالین کو ٹکڑے ٹکڑے کریں تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ قالین پہلے بڑی تھی اور ٹکڑے ہوجانے کی وجہ سے اس نے اپنے بڑے وجود کو کھودیا لیکن اگر ہم نے شروع سے ہی ایک چھوٹا سا قالیچہ تیار کیا ہو تو قالیچہ اعتراض اور فریاد کا حق نہیں رکھتا کہ مجھے چھوٹا کیوں بنایا؟ اس لیئے کہ وہ پہلے کچھ نہیں تھا اور اصلاً اس کا بڑا وجود ہی نہیں تھا. جو کسی نے چھینا ہو اور اس پر ظلم ہوا ہو.

خداوند عالم نے تمام موجودات کو اپنے حکیمانہ فرق کے ساتھ پیدا کیا اس سے قطع نظر کہ کوئی مخلوق یا موجود پہلے سے کوئی حق یا مطالبہ رکھتی ہو، اور اس نے دنیا میں ایک نظام قائم کیا (نظام علت و معلول) اور ہر موجود کیلئے ایک مناسب راستہ مقرر کردیا، اور وہ جو انتظار و توقع رکھتا ہے یا ذمہ داری اور فرمان دیتا ہے یا جو ثواب و (عذاب) ہے، اس میں ایک نسل کا دوسری نسل کے ساتھ یا ایک قوم کا دوسری قوم کے ساتھ یا ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ کسی بھی تبعیض کا قائل نہیں ہوا. اس نے حکم و جزا و سزا میں امکانات کی رعایت اور تناسب کو مدّ نظر رکھا اور اس نظام میں کسی قسم کا کوئی ظلم نہیں ہے. آپ ایک کارخانہ کو فرض کیجیئے جو چھوٹی چھوٹی میخیں اور پیچ بھی بناتا ہے اور بڑی گاڑی کے ٹائر بھی. کیا آپ اپنے آپ کو اس بات کی اجازت دیں گے کہ کارخانے کے بانی کو ٹائروں، پیچ، مہرہ و میخ کے مابین فرق کی خاطر ظلم کی نسبت دیں؟ اور کیا میخ و پیچ اعتراض کا حق رکھتے ہیں؟ البتہ اس کا جواب منفی ہے کیوں کہ ہم میں ایک گاڑی اور مشین کے

نظام میں اور چھوٹی میخوں کی ضرورت ہے اور اسی طرح بڑے ٹائروں کی بھی لیکن ایک زمانے میں ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا اور کارخانے کے بانی نے ان دونوں کو مصلحت کے مطابق دو مختلف کاموں کیلئے بنایا، یہاں پر صرف ظلم کی ایک صورت باقی رہتی ہے اور وہ یہ کہ ہم ٹائر کے بوجھ کو پیچ اور مہروں پر رکھیں، لیکن اگر ہر حصہ ایک کام کیلئے بنایا گیا ہو اور اس کی ظرفیت سے زیادہ کوئی چیز ہم نے اس پر بار نہیں کی، اور اُن میں سے کوئی بھی نہ تو پہلے سے موجود تھیں اور نہ کارخانے کے مالک سے کوئی مطالبہ اور نہ کوئی حق رکھتی ہیں، اور کارخانے کا مالک بھی ان سے ان کے اندازہ اور ظرفیت سے زیادہ توقع نہیں رکھتا ہے اس صورت میں کسی قسم کا ظلم قابل تصور نہیں ہے اب جب کہ عدل اور ظلم کے معنی واضح ہوگئے ایک نکتہ کی جانب توجہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ عدل کے معنی ہر جگہ اور ہمیشہ مساوات اور برابری کے معنی میں نہیں ہیں، اگر ایک استاد تمام شاگردوں کو (شاگرد کی زحمت اور تحصیل علم کی مقدار کو مد نظر رکھے بغیر) مساوی نمبر دے یہ انتہائی ظلم ہے۔ ایک ڈاکٹر بیماروں کی حالت کو مدّ نظر رکھے بغیر تمام بیماروں کو مساوی دوا دیدے یہ ظلم ہے۔ استاد اور ڈاکٹر کی عدالت ان دو مثالوں میں یہ ہے کہ نمبر اور دوا، متفاوت اور مختلف دیں لیکن یہ تفاوت اور اختلاف تبعیضی نہیں ہے یہ طبیعی فرق ہے اس میں اپنائیت، غیریت اور سفارش وغیرہ نہیں ہے، بلکہ تمام فرق حکمت پر مبنی ہیں لہذا ہر قسم کی نابرابری اور تفاوت جب تک حکمت کے مدار اور کسوٹی سے خارج نہ ہو جائے ظلم نہیں ہو گا۔

دوسرا نکتہ

خدا کے عدل پر بہت سے اعتراضات سطحی اور عجولانہ (جلد بازی) فیصلوں کی وجہ سے ہیں. ہماری قضاوت اور فیصلہ سطحی اور عجولانہ ہے.

چند مثالوں پر توجہ کیجیے:

فرض کیجیے اسلامی حکومت علاقہ میں لوگوں کی فلاح و بہبود کی خاطر ایک ۴۵ میٹر چوڑی سڑک بنانے کا حکم دیتی ہے، اس سڑک کا وجود عوام کی ضروریات اور گاڑیوں اور جمعیت کی کثرت کی بنا پر ضروری ہے لیکن ہر سڑک بنانے میں ایک گروہ اور طبقہ سردرد میں مبتلا ہوتا ہے تا کہ مکان کے پیسے حکومت سے لیں اور دوسرا مکان بنائیں اور زحمات و مشکلات کو برداشت کریں لیکن کچھ لوگوں کے رنج کی خاطر قوم کی بنیادی ضرورت اور عوام کی فلاح و بہبود کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، اسلام میں جو اہمیت فردی حقوق اور مالکیت کو ہے اس سے کہیں زیادہ اجتماعی حقوق مورد توجہ قرار پائے ہیں.

مثلاً امیر المؤمنین علی علیہ السلام مالک اشتر سے فرماتے ہیں: "جن لوگوں نے عوام کی ضرورت کے اموال کو چھپا رکھا ہے انھیں حاضر کرو اور پھر وعظ و نصیحت

اور نہی عن المنکر کرنے کے بعد اگر وہ پھر اپنے عمل کو جاری رکھیں اور اس پر قائم رہیں تو ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ "[۱] پھر فرماتے ہیں "سوال کو مخفی اور چھپانے کا عمل اگر چہ ایک فرد کیلئے مفید ہے۔ لیکن اجتماع کیلئے باعث ضرر و زیاں ہے "[۲] دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں " حکومت کو چلانے میں تمہاری توجہ عام لوگوں کی فلاح بہبود پر رہنی چاہیے خواص اس سے ناراض ہو جائیں "۔

ایک داستان :- ایک شخص کے گھر میں ایک کتا تھا، یہ شخص سامان خریدنے کیلئے گھر سے باہر گیا اور شیر خوار بچے کو گھر میں تنہا چھوڑ گیا اس امید پر کہ جلدی واپس آجائے گا۔ جب واپس آیا تو کتا خون آلودہ منہ کے ساتھ اس کے استقبال کو آیا، اس نے دل میں سوچا کہ کتے نے بچے پر حملہ کیا اور اس کو چیر پھاڑ ڈالا ہے، اس نے غصہ کی حالت میں ریوالور نکال کر کتے پر فائر کردیا۔ اور پھر جلدی سے گھر میں داخل ہو گیا لیکن یہاں پر صورت حال کچھ اور تھی ماجرا کچھ اس طرح تھا، کہ ایک بھڑیا گھر میں جو شہر سے باہر واقع تھا داخل ہوتا ہے اور چونکہ دروازے کھلے تھے کمروں میں داخل ہوتا ہے اور بچے پر حملہ کرتا ہے، کتے نے بچے کی حمایت کی اور کافی تلاش کے بعد بھیڑئے کو اپنے پنجوں اور دانتوں کے ساتھ پیچھے کی طرف ہٹاتا ہے اور اس کو زخمی کر کے پھاڑتا ہے لیکن صاحب خانہ کی جلد بازی اس بات کا موجب بن گئی کہ بجائے شکریہ کے اس نے کتے کو مار ڈالا!

۱۔ " فنکل بہ " یعنی اصول تخلف کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آؤ (نہج البلاغہ)

۲۔ " ذالک باب مضرۃ للعامۃ " یعنی اصول مخفی کرنے کا عمل قوم کو نقصان پہنچانے کیلئے ایک راستہ ہے (نہج البلاغہ)

گھر کا مالک اپنے کام پر پشیمان ہوا اور کتے کی طرف آیا تا کہ اس کو مرنے سے بچا سکے لیکن جو کام ہونا تھا وہ ہو چکا اور کتا مر گیا تھا. اور پشیمانی کا کوئی فائدہ نہیں تھا وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے کتے کی دو کھلی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا. تلف شدہ کتے کی کھلی ہوئی آنکھوں سے میں نے اس فریاد کو دل کے کانوں سے سنا کہ:

اے انسان تو کس قدر جلد بازی کرتا ہے، کتنی جلد تو قضاوت کرتا ہے؟ کیوں گھر میں جائے بغیر اور صحیح اطلاع حاصل کئے بغیر تو نے مجھے مار ڈالا. گھر کے مالک نے اس افسوس ناک واقعہ پر ایک مقالہ اس عنوان کے تحت "اے انسان تو کتنی جلدی قضاوت کرتا ہے" لکھا شاید کچھ لوگ ایسے ہوں جنہوں نے دعائیں کی ہوں اور استجاب نہ ہوئی ہوں اور پھر متوجہ ہوئے ہوں کہ کتنا اچھا ہوا کہ دعا مستجاب نہ ہوئی.

سطحی اور عجولانا فیصلوں پر قرآن کا اعتماد انہی سطحی اور جلد باز فیصلوں کی خاطر قرآن ہم کو ہمیشہ خبردار کرتا ہے کہ اے انسان تیرے بہت سے خیالات اور توہمات کوئی بنیاد نہیں رکھتے.

کیونکہ بہت سی چیزیں جو تمہاری نظر میں بری ہیں اور آپ ان کی نسبت کراہت رکھتے ہیں لیکن در حقیقت وہ آپ کے لئے مفید اور باعث نفع ہیں. اور بہت سی چیزیں جن کو تم دوست رکھتے ہو لیکن در حقیقت وہ تمہارے لئے شر ہیں. مثلاً جہاد کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ آپ اس کو ابتدائی اور سطحی تشخیص میں

برا سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ تمہارے لئے اچھا ہے [۱]

جنگ اور جہاد استعدادوں کو رونق عطا کرتا ہے صلاحیتوں کو آشکار بناتا ہے اور رہبر عالیقدر حضرت امام خمینیؒ کے ارشاد کے مطابق انسان کے وجود کا جوہر جنگ میں پروان چڑھتا ہے جنگ اور لڑائی میں جو صفیں نعرہ لگاتی ہیں اور جو صفیں عمل کرتی ہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں جنگ ہم مقصد قوتوں کو آپس میں متحد کرتی ہے جنگ انسان کو عظمت اور شرف عطا کرتی ہے اور اصولاً ظلم ستم کی شکار قوم کی حیات کی علامت جنگ کرنا ہے۔

سورۂ نساء آیہ ۱۹ میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ بسا اوقات تم ایک چیز کو ناگوار سمجھتے ہو لیکن خدا نے اس میں خیر کثیر قرار دیا ہے [۲]۔

اگر ہم (حسبان) کی لغت اور معنی اور اس کے مشتقات کو قرآن سے نکالیں تو ہم دیکھیں گے کہ قرآن کس قدر پے درپے ہمیں ڈراتا ہے کہ ایسا تصور نہ کرنا، ایسی فکر نہ کرنا، اس قسم کا گمان نہ کرنا، اور اس کے مانند دوسری تعبیرات سے جو سبھی سطحی اور عجولانہ فیصلوں پر مبنی ہیں۔

۱۔ " کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم و عسیٰ ان تکرھوا شیئا و ھو خیر لکم و عسیٰ ان تحبوا شیئا و ھو شر لکم " سورہ بقرہ آیہ / ۲۱۶ جہاد تم پر واجب کیا گیا جب کہ یہ حکم تم پر سنگین اور گراں ہے اور تمہاری کراہیت کا باعث ہے لیکن بسا اوقات ناگوار چیز در حقیقت مفید ثابت ہوتی ہے اور مفید چیز ناگوار ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ عسیٰ ان تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا۔

عجولانہ فیصلہ کا دوسرا نمونہ

ہم قرآن میں یوں پڑھتے ہیں کہ فرشتوں نے جو انسان کی نسبت عمیق اطلاع نہیں رکھتے تھے) بارگاہ خدا میں عرض کیا کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں ہماری عبادت کے باوجود تو کیوں مفسد انسان کو پیدا کرتا ہے ؟ لیکن چوں کہ خدا وند چاہتا تھا کہ اپنا ایک لائق جانشین زمین پر قائم کرے لہذا ایک بلادینے والے ماحول میں انسان کو بہت سے علوم عطا کر کے فرشتوں پر یہ ثابت کیا کہ انسان کے بارے میں ان کی فیصلہ سطحی اور عجولانہ ہے . مختصر یہ کہ اگر ہم خدا کے عدل کی بحث میں کسی شبہہ سے دوچار ہوجائیں کہ اگر خدا عادل ہے تو پھر کیوں ایسا اور کیوں ویسا ہے تو ، ہم میں توجہ کرنا چاہیے کہ ہمارے فیصلے اور ہماری تشخیص کچھ زیادہ درست نہیں ہیں اور بہت سے مسائل اور ان کے اسرار ہم پر پوشیدہ ہیں ہم علمی ، فکری اور تجربی لحاظ سے بھی محدود ہیں بہت سال اور عرصہ گزر گیا اور ہم جنگلوں کے وجود کو بے کار سمجھتے تھے لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ انھیں جنگلوں سے درجنوں قسم کے مادے نکالے گئے جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے .

کئی سال تک یہی کہتے تھے کہ لوزوں کا وجود بے فائدہ ہے اور اب کہتے ہیں کہ لوزہ سفید قسم کے خلیے بناتا ہے . جو جراثیموں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں ایک مدت تک چھوٹی آنت کو ایک بیکار چیز سمجھتے تھے اور آج کہتے ہیں کہ یہی اپنڈیس ، سرطان کے ساتھ مقابلہ میں موثر ثابت ہو سکتا ہے .

اگر ہم کسی ایسی کتاب کا جو عالی اور قیمتی مطالب پر مبنی ہے مطالعہ کریں

لیکن ہر چند سطروں کے بعد ایک ایسے نکتہ پر پہنچیں جس کے معنی معلوم نہ ہوں تو ہم میں جلدی قضاوت نہیں کرنی چاہیے اور مؤلف یا مصنف کے سلسلہ میں غلط فیصلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی فہم پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

اب جب کہ ہم عدل کے معنی سمجھ گئے اور ہم میں معلوم ہو گیا کہ بہت سے اعتراضات کی وجہ ہمارے سطحی اور عجولانہ فیصلہ ہیں اب ہم تیسرے نکتہ پر توجہ دیتے ہیں۔ جس میں ہم انسان کی ناراحتی کے علل و اسباب اور عوامل کی تلاش کریں گے۔

تیسرا نکتہ

اپنی پریشانیوں کے اسباب کی جستجو

ہم ناگوار حالات پیدا کرنے میں خود اپنے کردار سے غافل ہیں اور سب کو بغیر کسی سبب کے خدا کے حساب میں شمار کرتے ہیں اس طرح اعتراض شروع کردیتے ہیں کہ اے خدا اگر تو عادل ہے تو فلاں مصیبت اور پریشانی کیوں مجھ پر نازل ہوئی ؟ ظاہر ہے کہ بہت ساری پریشانیاں خود ہماری پیدا کردہ ہیں ، مثلاً حفظان صحت کے اصولوں کی رعایت نہیں کرتے تو بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں . نہی عن المنکر کے ذریعہ فحاشی اور فساد کی روک تھام نہیں کرتے(وہ بھی اپنے تمام زاویوں کے ساتھ) تو اشرار ہمارے سر پر مسلط ہوجاتے ہیں اور پھر ہماری دعا و فریاد بھی بے اثر ہو جاتی ہے ، گھر کے حوض پر اگر لوہے کی جالی نہیں لگائیں گے تو بچہ اس میں گر کر ڈوب سکتا ہے .

اس موضوع میں بھی ہمیشہ کی طرح قرآن کی راہنمائی حاصل کرتے ہوئے چند آیات کو اس سلسلے میں بیان کرتے ہیں .

۱. "و ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم " (شوری/ ۳۰)

ہر قسم کی سختی اور مصیبت جس سے تم دوچار ہوتے ہو یہ ان کاموں کا نتیجہ

ہے جنھیں تم نے اپنے ہاتھوں سے انجام دیا ہے اور پریشانیاں پیدا کرنے کا سبب خود آپ ہی ہو۔

۲۔" وان تصبھم سیئۃ بما قدمت ایدیھم اذاھم یقنطون" (روم / ۳۶)

اگر لوگوں کو خود ان کی بد اعمالی کی وجہ سے کوئی ناگواری پیش آئے تو فوراً ہمارے لطف سے مایوس ہوجاتے ہیں۔

اس آیت میں بھی سختی اور برائی کے وجود کا عامل خود ہماری روش بتائی گئی ہے۔

۳۔" واما اذا ما ابتلیہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اھانن" (والفجر)

خداوند عالم نے جب بھی انسان کو امتحان میں مبتلا کیا اور اس کو سختی سے دوچار کیا تو اس کی فریاد بلند ہوجاتی ہے اور یہ کہتا ہے کہ خدا نے میری اہانت کی ہے اور اس نے اپنا لطف مجھ پر کم کیا ہے، جب کہ ان کمیوں کی دلیل اور سبب کو اسے خود اپنے اندر تلاش کرنا چاہیے پھر آیت کے بعد والے حصہ کو ہم یوں پڑھتے ہیں۔

" کلا بل لاتکرمون الیتیم و لاتحاضون علی طعام المسکین"

یعنی ہرگز خدا کسی کی روزی اور مقدر کو بغیر کسی سبب کے منقطع نہیں فرماتا اگر آپ اپنے آپ کو سختی میں مبتلا پاتے ہیں تو یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ نے یتیم پر کرم نہیں کیا۔ اور لوگوں کو معاشرے کے محروموں کو کھانا کھلانے اور مدد پہنچانے کیلئے آمادہ نہیں کیا، تمہاری یہ بے توجہی اور سرد مہری خدا کے قہر و غضب کا باعث

ہوئی یہ آیت بھی خدا کے لطف میں فرق کا باعث، ہمارے اعمال کو قرار دیتی ہے۔

۴۔ "فکفرت بانعم اللہ فاذاقھا اللہ لباس الجوع و الخوف" (نحل/ ۱۱۲)

اس آیت میں خداوند عالم ایک ایسے دیہات کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ جس میں نعمتوں کی بہتات اور فراوانی تھی لیکن اس کے باشندوں نے ان نعمتوں سے انکار کیا، خداوند عالم نے بھی اس کے باشندوں کو خوف اور بھوک میں مبتلا کیا یہ آیت بھی اس بات کی طرف واضح اور روشن اشارہ کرتی ہے کہ بہت سی مشکلات کا عامل اور باعث خود ہماری ناشکری اور کفران نعمت ہے [۱]۔

عدل الٰہی سے متعلق سوالات کی تحقیق

تیسرے نکتہ میں ہم نے بیان کیا کہ بہت سی مشکلات کا باعث خود ہمارے اعمال ہیں یہ ہم ہیں کہ اپنی ناروا رفتار کے ساتھ خدا کے قہر و غضب اور مشکلات سے دوچار ہو جاتے ہیں اس سلسلے میں کچھ سوالات بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ہم زندگی میں، ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو کسی قسم کے ظلم وستم سے دریغ نہیں کرتے جب کہ وہ خوشی اور آرام کی حالت میں بھی ہیں؛ آپ جو یہ کہتے ہیں کہ مشکلات ہمارے اعمال کی وجہ سے ہیں تو فلاں شخص جس کا کردار ہم

۱۔ سورۂ کہف آیہ ۶۸۔ حضرت خضر کے ہمراہ حضرت موسیٰ کی داستان جو سورۂ کہف میں بیان ہوئی ہے اور اسکے باوجود کہ حضرت خضرؑ نے پہلے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ مجھ سے خارق العادہ کام سرزد ہونگے چونکہ آپ ان کے امور سے واقف نہیں۔ لہذا ان کو برداشت نہیں کرینگے، لیکن حضرت موسیٰؑ نے کہا انشاء اللہ میں صبر کرونگا تجربہ نے ثابت کیا کہ اسرار سے بے خبری سبب بن گئی کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ حضرت خضرؑ سے جدا ہو گئے۔

سے بدتر اور جس کا ماضی ہم سے زیادہ خراب ہے ہماری طرح مشکلات اور تکالیف میں کیوں مبتلا نہیں ہوا ؟

جواب :- آیات اور روایات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے تمام لوگوں اور گروہوں کا حساب کتاب خدا کے نزدیک یکساں نہیں ہے .

۱:- ایک گروہ کو فوراً سزا دیتا ہے .

۲:- ایک گروہ کو کچھ مدت تک مہلت دیتا ہے .

۳:- ایک گروہ کو آخر عمر تک ان کے تمام مظالم کے باوجود سزا نہیں دیتا ہے اور قیامت کے لیئے چھوڑ دیتا ہے . کیونکہ ہم اپنے مکتب فکر میں دنیا کو قیامت سے جدا تصور نہیں کرتے ہیں .

ایک معلّم ممکن ہے اپنی کلاس کے شاگردوں کیلئے چند قسم کی روش سے کام کرے بعض افراد کو فوری قہر و غضب کے ساتھ تنبیہ کرے ، اور بعض کی نسبت کچھ مدت تک مہلت سے کام لے اور بعض کے متعلق جو سب سے بدتر ہیں کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہ کرے اور سب کو سال کے آخر تک امتحان کے نمبر دینے تک کیلئے چھوڑ دے . اس قسم کا فرق اور تفاوت خداوند عالم کی جانب سے حکیمانہ ہے کیونکہ خطاکار افراد ، انکا حوصلہ اور نوعیّت عمل آپس میں یکساں اور برابر نہیں ہے کہ برابری کا حساب بھی کیا جائے . کبھی معلّم ایک ممتاز شاگرد کی غلطی پر سخت رد عمل ظاہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگوں سے اس کام کی توقع نہیں رکھتا ، جب کہ معمولی اور برے شاگردوں کی نسبت اس قسم کا شدید رد عمل دیکھنے میں نہیں آتا .

قرآن کریم میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوند عالم پیغمبروں اور اولیاء کو کبھی ایک عمل کی وجہ سے (کہ جو گناہ بھی نہیں ہے) سخت مورد اعتراض قرار دیتا ہے کیونکہ وہ ان ہستیوں سے ایسی توقع نہیں رکھتا۔ لیکن دوسرے افراد کے متعلق ہم پڑھتے ہیں "جعلنا لمهلكهم موعداً" (کہف / ۵۸) دیہات کے باشندوں کے ظلم کے بعد ہمارا انکو ہلاک کرنا کچھ مقررات کے مطابق اور ایک معین تاریخ میں انجام پذیر ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ جونہی لوگ خطا کریں ہم فوراً ان کو مختلف قسم کی بلاؤں میں مبتلا کردیں بلکہ ہماری سزا میں، وعدہ، صبر اور فرصت کا بھی بیان ہے۔

"ویستعجلونک بالعذاب و لن یخلف الله وعده" (حج / ۴۷)

ہم اقوام کی ہلاکت کی تاریخ لوگوں کیلئے بیان کرتے ہیں یہ کفار کہتے ہیں کہ ہم پر کیوں عذاب نازل نہیں ہوتا اور ہم کفر و ظلم وستم کے باوجود اسی طرح عیش و آرام میں ہیں۔ یہ خدا کے عذاب اور قہر کی جانب جلدی کرتے ہیں جب کہ خدا اپنے وعدہ پر عمل کرے گا لیکن ابھی اس کی مدت نہیں پہنچی ہے۔

لہذا کبھی خداوند عالم ظالم لوگوں کے متعلق فوری طور پر ردعمل ظاہر نہیں کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ "فامليت للذين كفروا ثم اخذتهم" (رعد / ۳۲) میں شروع میں کفار کو مہلت دیتا ہوں اور پھر انکو گرفتار کرتا ہے۔

کفار کو مہلت دینے کے متعلق بھی خدا ارشاد فرماتا ہے:

"لا يحسبن الذين كفروا انما نملي لهم خير لانفسهم انما نملي لهم ليزدادوا اثماً و لهم عذاب مهين" (آل عمران / ۱۷۸) وہ لوگ جو کافر ہو گئے (اور انھوں نے

سرکشی کی راہ کواختیارکرلیا) یہ گمان نہ کریں کہ ہم ان کو جو مہلت دیتے ہیں وہ ان کے لیئے مفید ہے ہم ان کو مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے گناہوں میں اضافہ کریں اوران کا پیمانہ بھر جائے اس کے بعد ذلیل اور رسو کرنے والا عذاب ان کی گھات میں ہے۔

امام حسینؑ کو شہیدکرنے کے بعد یزید نے اپنے آپ کو کامیاب سمجھا، لیکن جناب زینب علیہا السلام نے اس کے لیے اسی آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ تیری موجودہ قدرت، کامیابی، آزادی اور عیش اس لیے ہے تا کہ تیرے گناہوں کا بار سنگین تر ہوجائے اور بنیادی طور پر یہی وقتی عیش و آرام عذاب کا بہترین وسیلہ ہے کیونکہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم بعض لوگوں کو زیادہ آرام عطا کرتے ہیں تا کہ خوب اس سے دلچسپی پیدا کریں پھر اچانک ہم اس عیش کو چھین لیتے ہیں تا کہ وہ حسرت و یاس کی آگ میں جلیں " فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم ابواب کل شی حتی اذا فرحوا بما اتوا اخذناهم بغتة فاذاهم مبلسون" (انعام/ ۴۴)

جب انھوں ہماری نصیحتوں کو فراموش کیا اور عملاً ہمارے فرامین و دستورات سے بے توجہی و بےاعتنائی کا اظہار کیا تو ہم نے ہر چیز کا دروازہ ان پر کھول دیا، خوشی اورراحت نے ہر طرف سے انکو گھیر لیا تا کہ وہ شاد اورخوشحال ہوں اور اس سے دل لگالیں پھر اچانک ہم نے تمام خوشیوں کو جن سے وہ دل لگائے ہوئے تھے ان سے چھین لیا یہ اسلیے کہ حیرت و یاس وغم کی آگ ان کو اندرسے جلا دے، اس قسم کے لوگوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ایک درخت کی بلندی کی

طرف چڑھتا جارہا ہے اور اپنے خیال میں وہ کامیاب ہے لیکن اس کے نیچے گرنے سے اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا بلندی کی طرف جانا اس کے عذاب کا مقدمہ تھا البتہ جیسا کہ خداوندعالم اس قسم کے افراد کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے ایک دوسرے گروہ کے متعلق جو قابل اصلاح ہوتے ہیں اور ان کے اندر امید کی کرن موجود ہوتی ہے ان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے "ولیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون" (روم / ۴۱) ان کے برے اعمال کی نسبت ہم تلخ سزا کا کچھ حصہ انھیں چکھاتے ہیں تا کہ وہ لوٹ آئیں اور انکی اصلاح ہوجائے شاید آیات کی یہ مقدار، اس سوال کے جواب کیلئے کافی ہوگی کہ کیوں بعض افراد ہر قسم کی غلطی اور برے اعمال کرنے کے باوجود پھر آرام و راحت میں ہیں اور کیوں بعض افراد کو میرے عمل کی فوراً سزا مل جاتی ہے۔

یہاں پر فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم کچھ روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ہم میں آگاہ کرتی ہیں کہ اگر آپ مسلسل اور پے در پے گناہوں کا ارتکاب کرتے رہیں اور اپنی زندگی میں خدا کے قہر و غضب کے آثار کو مشاہدہ نہیں کرتے ہیں تو اس بات سے ڈریں کہ کہیں آپ تنبیہ و قابلیت کے مدار و محور سے خارج تو نہیں ہوگئے اور صرف بری عاقبت اور جہنم ہی آپکا ٹھکانا ہو۔ کبھی بیمار کا حال اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ ڈاکٹر اس کو چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے جو کچھ کھانا چاہتا ہے اس کو کھانے دو۔ کوئی اور نسخہ نہیں لکھتا بعض ایسے لوگ ہیں جو اسقدر گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں خدا کی روش ان کے ساتھ ایسی ہوجاتی ہے، کہ وہ

ناراض ہو کر یہ کہتا " اعملوا ما شئتم " (فصلت / ۴۰) جو کام چاہو انجام دو (یا جو مرضی آئے کرو) پیغمبران خدا بھی جب لوگوں کے دعوت قبول کرنے سے مایوس ہوجاتے تھے تو ان سے کہتے تھے "یا قوم اعملوا علیٰ مکانتکم" (ہود / ۹۳) اے لوگو جو اپنی باطل روش پر اصرار کرتے ہو جو چاہتے ہو کرو۔ دعاؤں میں اکثر ہم پڑھتے ہیں " الٰھی لاتکلنی الیٰ نفسی " اے خدا مجھ کو اپنے حال پر رہا نہ کرنا۔

مختصر یہ کہ کبھی خدا کا قہر اسی عیش و آرام کے ذریعہ ہوتا ہے جو ستمگاروں کو توبہ کرنے سے روکتا ہے اور قیامت کی سزا ان کی کمین گاہ میں ہے۔

چوتھا نکتہ

کبھی انسان کوئی گناہ اور تقصیر نہ کرنے کے باوجود مشکلات سے دوچار ہو جاتا ہے، عدل الٰہی اور ان مشکلات کے متعلق قرآن کا تجزیہ کیا ہے ؟

جواب :- قرآن کریم میں تقریبا بیس ۲۰ مرتبہ الٰہی امتحان کے بارے میں بتایا گیا ہے لہذا انسان کے متعلق خدا کی حتمی سنتوں اور منصوبوں میں سے ایک منصوبہ اس کا امتحان لینا ہے اور یہ مشکلات الٰہی امتحان کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، جس طرح سے خوشیاں اس امتحان کیلئے ایک دوسرا وسیلہ اور ذریعہ ہیں.

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے " ولنبلونکم بشی من الخوف والجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرات و بشرالصابرین " (بقرہ/ ۱۵۵)

بلاشبہ ہم خوف، بھوک، قحط مال و جان اور میووں کی کمی کے ذریعہ تمہیں آزمائیں گے اور وہ لوگ جو ان حوادث میں ثابت قدم رہتے ہیں اور صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں ان کو خوشخبری سنادو.

یہاں پر چند مسئلوں کے بارے میں بحث ہونی چاہیے.

۱ :- کیا خدا نہیں جانتا کہ کون شخص کیسا ہے جو مشکلات کے ذریعہ امتحان لیتا ہے ؟

۲۔ آزمائش اور امتحان کے وسائل واسباب کیا ہیں ؟

۳۔ لوگوں کا ردعمل تلخ و ناگوار حوادث کے مقابلے میں کیسا ہے ؟

۴۔ مشکلات پر فائق آنے کا راستہ کونسا ہے ؟

پہلا مسئلہ

یہ بات واضح ہے کہ خدا کا امتحان ہماری صورتحال ، حوصلہ اور عمل سے متعلق علم و آگاہی کی خاطر نہیں ہے کیونکہ وہ ہر قسم کی فکر و عمل سے پہلے جانتا ہے کہ ہم کیسے فکر کرتے ہیں اور ہم کیسے عمل کرینگے ، بلکہ امتحان کا مقصد یہ ہے کہ ہم سے کوئی ایسا کام انجام پائے جس کے ذریعہ ہم جزا یا سزا کے مستحق قرار پائیں کیونکہ خداوند اپنے علم کے مطابق کسی شخص کو اس کی خوبی اور بدی کی جزا اور سزا نہیں دیتا ہے [1] (جب تک اس نے کوئی عمل نہ انجام دیا ہو)

دوسرا مسئلہ

دوسرے موضوع کے متعلق بھی ہم نے عرض کیا کہ تمام تلخ اور شیرین حوادث انسان کے امتحان کے اسباب اور وسائل ہیں .

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے "ونبلوکم بالشر والخیر" (انبیاء/۳۵) انسان کی جان اور مال امتحان کے اسباب اور وسائل ہیں . "لتبلون فی اموالکم و انفسکم " (آل عمران / ۱۸۶) یقیناً تمہارا امتحان تمہارے اموال اور تمہاری جان کے ذریعہ لیا جائیگا .

۱۔ اس معنی کو ہم نے حضرت علی علیہ السلام سے نقل نہج البلاغہ میں استفادہ کیا ہے . تفسیر نمونہ جلد اول .

تیسرا مسئلہ

میرے دوستوں میں سے کسی نے کہا تھا کہ حوادث کے مقابلے میں لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔

ایک گروہ ایسا ہے کہ جونہی وہ تلخ حوادث سے روبرو ہوتا ہے تو اس کی آہ و فریاد بلند ہو جاتی ہے، یہ گروہ خدا کے عدل اور اس کے لطف و حکمت اور پیدائش و تخلیقی نظام کو برا کہنے لگتا ہے۔

قرآن اس گروہ کا یوں تعارف کراتا ہے " اذا مسہ الشر جزوعا " (معارج / ۲۰) جونہی ان لوگوں تک کوئی سختی یا شر پہنچا ہے ان کی آہ و فریاد بلند ہونے لگتی ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو سختیوں کو استقامت اور پائیداری کے ساتھ برداشت کرتے ہیں اور دل و زبان سے کہتے ہیں" ہم سب خدا کیلئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائینگے " (بقرہ / ۱۵۵)۔

تیسرے گروہ نے دوسرے گروہ سے زیادہ رشد پیدا کیا ہے کیونکہ وہ سختیوں کے مقابلے میں نہ صرف صبر و تحمل کرتے ہیں بلکہ شکر بھی بجا لاتے ہیں۔ لہذا زیارت عاشورا میں ہم یوں پڑھتے ہیں "اللھم لک الحمدحمد الشاکرین لک علی مصابھم " [1] اے خدا میرا شکر تیری بارگاہ میں ویسا ہی شکر ہو جیسا شکر امام حسینؑ کے ساتھیوں کا ہے۔ ہاں بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کی سب سے بڑی

۱۔ ان جملوں میں سے ہے جو زیارت عاشورہ کے آخر میں سجدہ کی حالت میں پڑھے جاتے ہیں۔

تمنا خدا کی راہ میں سختی اور شہادت کو تحمل کرنا ہے اور جونہی وہ اپنی اس آرزو تک پہنچتے ہیں شکر ادا کرتے ہیں.

چوتھا گروہ جو تیسرے گروہ سے بھی دو قدم آگے ہے اس میں وہ لوگ ہیں جو مشکلات پڑتے وقت نہ صرف خدا کے لطف اور اس کے عدل سے بدبین نہیں ہیں اور نہ صرف صبر یا شکر کرتے ہیں بلکہ والہانہ طور پر مشکلات کا استقبال بھی کرتے ہیں. ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعض صحابی آپ کی خدمت میں پہنچے اور انھوں نے جنگ میں شرکت کرنے کیلئے جنگی وسائل اور امداد کا تقاضا کیا، پیغمبرؐ نے فرمایا " میرے پاس کوئی وسیلہ (تلوار یا گھوڑا) نہیں ہے جس کے ذریعہ تمہاری مدد کروں وہ روتے ہوئے پلٹ گئے کہ ہم اپنے آپ کو سپاہ اسلام تک پہنچا سکے اور کیوں نہ اپنی جان کو اسلام کی راہ میں فدا کر سکے (سورہ توبہ / ۹۲)

ہاں عوام کا ردعمل حوادث کے مقابل میں مختلف ہے. اگر آپ تند قسم کی پیاز ایک بچے کو دیں جونہی بچہ اس پر دانت رکھتا ہے، اس کو دور پھینک دیتا ہے، اس کی آنکھوں سے آنسوں بہنے لگتے ہیں، لیکن اسی تند پیاز کو باپ تلاش کر کے خرید کر لاتا ہے. زندگی کی سختیاں اور تلخیاں بھی اسی طرح کی ہیں ایک ان سے بھاگتا ہے اور دوسرا ان کا استقبال کرتا ہے.

چوتھا مسئلہ

ہم نے عرض کیا کہ خدا عادل ہے اور بعض مشکلات کبھی ہمارے امتحان کی خاطر ہیں تا کہ ہماری باطنی صلاحیتیں اجاگر ہو جائیں اب یہ دیکھیں کہ ہم میں کیا

کرنا چاہیے تا کہ حوادث پر کامیاب ہو سکیں اس مسئلہ میں بھی ہمیشہ کی طرح قرآن کے سائے میں راستہ تلاش کریں، وہ راستے جو اس سلسلے میں قرآن دکھاتا ہے اس طرح ہیں۔

۱۔ ایک الٰہی مکتب فکر رکھنا۔

قرآن کریم صابر لوگوں کی ستائش و مدح میں فرماتا ہے کہ یہ لوگ ایک الٰہی کائناتی تصور رکھنے کی خاطر حوادث کے مقابلے میں کہتے ہیں کہ ہم خدا کیلئے ہیں ذاتی طور پر مستقل نہیں ہیں، اور اس سے کسی چیز کا مطالبہ بھی نہیں رکھتے ہمارا آنا، ہمارا وجود اور ہماری نعمتیں سب اس کی ہیں اور ہم صرف امانتدار ہیں۔

یہ ایک طرف دوسری طرف یہ کہ دنیا ہمارے لیئے ایک گذرگاہ ہے، یہ ہمارے لیئے ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم کیوں گئے ہم مرنے کے بعد اس کی طرف جاتے ہیں اور ہرگز ختم نہیں ہو جاتے۔

جیسے اب موجود ہیں مرنے کے بعد بھی موجود رہیں گے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے صرف ہمارے رہنے کی جگہ بدل جاتی ہے ہم محو نہیں ہو جاتے، یہ کائناتی نقطۂ اور نظر انسان کو صحیح طور پر حوادث کے ساتھ مقابلے کیلئے آمادہ کرتا ہے، ہاں، بجا طور پر ان کا یہ نظریہ اور " انا للہ وانا الیہ راجعون " (بقرہ/۱۵۶) کے جملے میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

۲۔ الٰہی سنتوں کے بارے میں اطلاع

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ انسان کوئی جدا اور الگ تھلگ چیز نہیں ہے جو

بغیر کسی رنج، تکلیف اور زحمت کے بہشت تک پہنچ جائے بلکہ لازم ہے کہ دوسری قوموں اور شخصیتوں کی طرح سخت ترین حوادث میں مبتلا ہو۔

"ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستهم الباسا والضراء وزلزلوا حتیٰ یقول الرسول والذین امنوا معه متی نصر الله الا ان نصر الله قریب" (بقرہ ۲۱۴)

کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ گذشتہ امتوں کے حوادث سے روبرو ہوئے بغیر آپ بہشت میں داخل ہو جائینگے؟!

تم سے پہلے مؤمنین وہ لوگ تھے کہ مختلف قسم کی سختیاں جب ان تک پہنچیں یہاں تک کہ ان سب کو اضطراب نے گھیر لیا اور پیغمبرؐ اور مؤمنین نے کہا کہ خدا کی مدد کہاں ہے لیکن آپ آگاہ رہیں کہ خدا کی مدد نزدیک ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اہل حق تاریخ میں سخت ترین مشکلات سے دو چار ہوئے ہیں، اب تمہاری باری ہے لہذا نہ مشکلات کوئی نئی چیز ہیں اور نہ ان سے روبرو ہونے والے صرف تم ہو۔ یہ ایک تاریخی فارمولہ اور سنت ہے جس کو طے ہونا ہے۔ قرآن بارہا پیغمبر اکرمؐ سے فرماتا ہے کہ فلاں امت، گروہ یا شخصیت کی تاریخ کو دیکھو تا کہ یہ فکر نہ کرو کہ سختیاں آپ ہی کیلئے تازہ ہیں[1]

۱۔ تمام آیات " واذکر فی الکتاب ابراهیم " (مریم / ۴۱) " واذکر فی الکتاب موسی " (مریم / ۵۱) میں اسی سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے اور سورہ احقاف آیت نمبر ۳۵ میں ہم پڑھتے ہیں " واصبر کما صبر اولو العزم من الرسل " یعنی آپ بھی تمام انبیاء کی طرح صبر کرنا کیجئے۔

ہاں اگر انسان یہ جان لے کہ سختیاں بھی ایک قانون، سنّت، عمومی اور سب کیلئے ہیں تو بیشتر آمادگی پیدا کرتا ہے۔

رمضان المبارک کے مہینے میں جب سب لوگ روزہ سے ہیں تو آپ بھی آسانی کے ساتھ روزہ رکھتے ہیں کیونکہ یہ ایک عمومی عمل ہے لیکن ماہ رمضان کے علاوہ جب کوئی بھی شخص روزہ سے نہیں ہے تو آپ کے لیے تنہا روزہ رکھنا مشکل ہے قرآن جونہی روزہ کا حکم دیتا ہے ساتھ ہی ارشاد فرماتا ہے کہ: اے مسلمانو تم یہ خیال نہ کرو کہ یہ حکم صرف تمہارے لیے مخصوص ہے بلکہ تم سے پہلے کی امتیں بھی روزہ رکھتی تھیں " کما کتب علی الذین من قبلکم " ہاں البتہ گذشتہ تاریخ کے بارے میں علم و جانکاری انسان کی بردباری اور صبر میں کافی موثر ہے جیسا کہ مستقبل کے اسرار کے بارے میں علم بھی، صبر و تحمل کے میدان میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔

حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کیونکہ تو میرے کام کے اسرار سے واقف نہیں لہذا کم ہمتی دکھاتے ہو " و کیف تصبر علی ما لم تحط به صبراً "[1]

۱۔ سورۂ کہف آیہ ۶۸۔ حضرت خضر کے ہمراہ حضرت موسیٰ کی داستان جو سورۂ کہف میں بیان ہوئی ہے اور اس کے باوجود کہ حضرت خضرؑ نے پہلے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ مجھ سے خارق العادہ کام سرزد ہونگے چونکہ آپ ان کے امور سے واقف نہیں۔ لہذا ان کو برداشت نہیں کرینگے، اور حضرت موسیٰؑ نے کہا انشاء اللہ میں صبر کرونگا لیکن تجربہ نے ثابت کیا کہ اسرار سے بے خبری سبب بن گئی کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ حضرت خضرؑ سے جدا ہو گئے۔

۳ ۔ خداوندعالم کے حضور میں کامل توجہ اور یہ کہ وہ میری بات سنتا ہے ، میرے کام کو دیکھتا ہے اور وہ مشکلات کو آسان کرتا ہے . خدا وندعالم حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ سے فرماتا ہے تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اپنے مقاصد بیان کرو میں تمہارے ساتھ ہوں تمہارے کام کو دیکھتا ہوں اور تمہاری گفتگو سنتا ہوں "انی معکما اسمع وارٰی " (سورۂ طٰہٰ ۴۶) اسی طرح خداوندعالم نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا کہ ہمارے زیر نظر کشتی تیار کرو "واصنع الفلک باعیننا" (سورۂ ھود ۳۷) حضرت نوحؑ نے جونہی کشتی بنانا شروع کی کفار کا ہر گروہ جو ان کے پاس سے گذرتا تھا ان کا مذاق اڑاتا اور کہتا ، کیا تم نے پیغمبری کا کام چھوڑ کر نجاری کا کام پکڑ لیا ہے ؛ ان طعنوں کے مقابلے میں جس چیز نے حضرت نوحؑ کو پائیدار بنا رکھا تھا وہ خداوندعالم کا یہ جملہ تھا کہ اے نوحؑ تم ہمارے سامنے ، تمہارا کام ہمارے زیر نظر ہے اس قسم کا ایمان اور جذبہ پائیداری و استقامت کو انسان کے اندر زندہ کرتا ہے .

۴ ۔ چوتھی چیز جو استقامت کی روح ، انسان کے اندر زندہ کرسکتی ہے وہ اس کے اجر و جزا پر توجہ رکھنا ہے، کیونکہ انسان کیلئے سختیوں کو برداشت کرنا آخرت کے عظیم اجر و ثواب کے ہمراہ ہے پورے قرآن میں اس قسم کے امتیازات کے نمونے پائے جاتے ہیں.

۵ ۔ پانچویں طاقت جو انسان کو استقامت عطا کرسکتی ہے وہ صبر دعا اور نماز کے ذریعہ خدا سے مدد طلب کرنا ہے .

"واستعینو بالصبر والصلوۃ" (سورہ بقرہ ۴۵ و ۱۵۳) اور سورہ اعراف میں یوں ہے "واستعینوا باللہ" اس مطلب کا خلاصہ یہ ہوا کہ خداوند عالم عادل ہے اور وہ مشکلات جن سے ہم دوچار ہوتے ہیں. خدا کی طرف سے امتحان کے طور پر ہیں اور لوگوں کی ان امتحانات کے سلسلے میں چار قسمیں ہیں نیز وہ راستے جو ہم میں امتحانات میں کامیاب بنا سکتے ہیں بیان کیے گئے ہیں.

پانچواں نکتہ

بہت سے شبہات جو عدل الٰہی کے متعلق بیان ہوئے ہیں وہ کج فہمیوں اور نہ سمجھنے کی بناپر ہیں کہ ہم بغیر کسی توجہ کے خدا پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں مثلاً ہم تصور کرتے ہیں کہ موت فنا کا نام ہے اور اعتراض کرتے ہیں. کہ فلاں شخص کیوں مرگیا ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا رہنے کی جگہ ہے اور یہ تصور کرتے ہیں کہ کیوں لوگ زلزلہ یا سیلاب یا بیماری کیوجہ سے مرجائے ہیں.

ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ دنیا عیش و آرام کی جگہ ہے اور یہ کہتے ہیں کہ سختی اور مصیبت کیوں ہے. ہماری مثال اس شخص جیسی ہے جو تقریر کے ہال میں داخل ہوتے ہی اعتراض کرنا شروع کر دے کہ چائے کیا ہوئی کھانا کیوں نہیں لاتے ہیں، آرام کرنے کے لیے بستر کیوں نہیں ہے؛ وغیرہ وغیرہ؛

یہ تمام سوالات اور اعتراضات صرف ایک خیال اور تصور کی وجہ سے ہیں

اور وہ کج فہمی و بدگمانی ہے۔ اس نے یہ تصور کیا کہ یہاں کھانے کی دعوت کا حال ہے ؛ ہم اگر اس کو اس فکر سے باہر لے آئیں اور اس کو یہ سمجھائیں کہ یہاں درس کا ہال ہے نہ کہ کھانے کی دعوت کا۔ تو وہ اپنے تمام اعتراضات سے صرف نظر اور معذرت خواہی کریگا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم دنیا کو ویسے ہی پہچانیں جو اس کے پہچاننے کا حق ہے اور اپنے پیدائش کے مقصد کو سمجھ لیں اس صورت میں خود بخود ہمارے اشکالات بر طرف ہو جائیں گے ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا ٹھہرنے اور رکنے کی جگہ نہیں ہے ، بلکہ صرف ایک گذرگاہ ہے، اگر ہم نے یہ یقین کر لیا، تو کچھ اشکالات (کہ اگر خدا عادل ہے تو کیوں لوگ ، زلزلہ، سیلاب جرائیم اور موت کی ذریعہ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں) بر طرف ہو جاتے ہیں، کیونکہ ہم ٹھہرنے کیلئے نہیں آئے ہیں بلکہ جانے کیلئے آئے ہیں بہر حال ہم میں جانا ہے چاہے یہ جانا کسی بھی طریقے سے ہو ، زلزلہ کے ذریعہ ہو یا سیلاب کے ذریعہ یا کسی اور طریقے سے

مثال :۔ گلاس فروش نے اپنے گلاسوں کو منہ کے بل دکان میں سجا رکھا تھا اس نے دیکھا ایک خریدار بڑے غور سے گلاسوں کو دیکھ رہا ہے۔ پھر ان پر اس نے ہاتھ پھیرا اور اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ بھائی جان اس گلاس کا منہ بند ہے پھر گلاس کو اس نے اسی الٹی طرف سے اٹھایا اور کہا کہ اس گلاس کا تو نچلا حصہ بھی نہیں ہے دکاندار نے ایک قہقہہ لگایا اور گلاس کو اس سے لیکر اصلی حالت میں پلٹا دیا اور اس سے کہا کہ بھائی جان اس گلاس کا نچلہ حصہ بھی ہے اور اس کا

منہ بھی کھلا ہے۔

ہمارے بہت سے اعتراضات پیدائش اور خلقت کے سلسلے میں ہماری کج فہمی کی وجہ سے ہیں جس شخص نے سرخ عینک لگا رکھی ہے وہ مجبوراً ہر شلغم کو چقندر دیکھے گا. مختصر یہ کہ ہمارے بعض اعتراضات غلط تفسیر رائے کی بنا پر ہیں کہ انسان اور اسکا مقصد یہ کہ ہم دنیا والے ہیں، ہم تصور کرتے ہیں کہ دنیا ایک عشرتکدہ ہے اس کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کے باوجود ہم کیوں ناکام ہیں؟ جب کہ دنیا ترقی کا میدان ہے، آخرت کی کھیتی ہے، لازمی طور پر رشد و نمو وزراعت کا میدان تلاش و جدوجہد، پسینہ بہانے اور مشکلات اٹھانے کی جگہ ہے۔

معاشرہ ساز فرق

ہم اگر چند مسئلوں کو قبول کرلیں تو سمجھ جائیں گے کہ یہ فرق اور تفاوت کتنا اہم کردار ہماری زندگی میں ادا کرتے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ کہ انسان کی زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے[۱]. یعنی ہم خود بخود اگنے والی گھاس کی طرح نہیں ہیں کہ خود بخود سبز ہو جائیں، سوکھ جائیں اور کسی دوسرے سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔

۱۔ البتہ انسان کے اجتماعی ہونے کے فلسفہ میں دو نظریے ہیں: پہلا نظریہ یہ ہے کہ جبر انسان کی زندگی کو اجتماعی زندگی کیلئے مجبور کرتا ہے دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسان طبعی طور پر بغیر جبر کے اجتماعی زندگی کی طرف رجحان رکھتا ہے اور انفرادی زندگی سے متنفر ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ اجتماعی زندگی کو ایک دوسرے کے تعاون اور مدد کے بغیر آگے نہیں بڑھا سکتے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ تعاون صرف فرق کی صورت میں میسر ہے کیونکہ ہر ایک شخص ممکن ہے کسی ایک پیشے، ہنر اور شعبہ میں توانا ہو اور دوسرے شعبوں میں کمزور ہو طاقت، ذوق و شوق اور حوصلوں میں فرق ضرورت و احتیاج کی پیدائش کا سبب بنتا ہے اور ضرورت بھی سماج کے پیدا ہونے کی ایک عامل ہے تاکہ ہر گروہ اور ہر فرد دوسرے کی ضرورت کو پورا کر سکے۔ لہٰذا یہ فرق ضرورت آفرین ہے اور ضرورتیں معاشرہ ساز ہیں اور انسان کا رشد و نمو معاشرہ کے سائے میں ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ پریشانیوں اور تلخ حوادث سے روبرو ہونا انسان کیلئے بیدار رہنے کی گھنٹی ہے۔ کیونکہ یکساں طور پر زندگی انسان کو سست اور تن پرور بنا دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر سڑک مکمل طور پر صاف اور سیدھی ہو تو ڈرائیور کو اسمیں نیند آجاتی ہے۔ اسلامی روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوندعالم اپنے نیک اور صالح بندوں کو زیادہ مشکلات سے دوچار کرتا ہے۔

"عن ابیعبد اللہ علیہ اسلام، انّ اشدّ النّاس بلاءً الانبیاء ثمّ الّذین یلونھم ثمّ الامثل فالامثل" (بحار ج ۸۱ /ص ۱۹۵ نقل از عدل از دیدگاہ تشیع) امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ سخت ترین مشکلات سے انبیاءؑ دوچار ہوئے ہیں ان کے بعد وہ لوگ جو انبیاءؑ کے ساتھ نزدیک ترین رابطہ رکھتے اور ان سے محبت کرتے زیادہ تلخیوں سے دوچار ہوتے ہیں ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوندعالم ایمان

والوں کی اس طرح سختیوں اور مصیبتوں کے ذریعہ پرورش کرتا اور پالتا ہے. جس طرح ماں اپنے بچے کو دودھ کے ذریعہ پرورش کرتی اور پالتی ہے.

سختیاں نہ صرف ظاہر ہونے کے وقت سے انسان کی تعمیر میں ایک موثر کردار ادا کرسکتی ہیں بلکہ گذشتہ سختیوں اور مشکلات پر توجہ کرنا اور ان کی یاد بھی انسان کی تعمیر کے سلسلے میں ایک موثر چیز ہے. قرآن میں ہم پڑھتے ہیں " الم یجدک یتیماً فاویٰ و وجدک عائلاً فاغنی " (الضحیٰ) اس نے تم کو یتیم پایا تو پناہ دی اور ضرورتمند دیکھا تو بے نیاز کردیا. اب جب کہ تم طاقت کی مسند پر پہنچ گئے تو یتیم پر ظلم مت کرو اور اس کو مت جھڑکو اور محتاج کے ساتھ سختی نہ کرو. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوندعالم گذشتہ مشکلات کی یاد کو بھی انسانوں کی ترقی اور اس کی تربیت کے سلسلے میں موثر سمجھتا ہے.

قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے کہ سختیاں دل کا زنگ دور کرنے اور تضرع و زاری کیلئے ہیں " ولقد ارسلنا الیٰ امم من قبلک فاخذناہم بالباساء و الضراء لعلہم یتضرعون " (انعام / ۴۲) تم سے پہلے کی امتوں کی طرف ہم نے انبیاءؑ کو بھیجا اور ہم نے ان کو سختی اور تنگ دستی میں مبتلا کیا تاکہ وہ تضرع وزاری کریں اور اسی کے مانند سورۂ اعراف کی آیت ۹۴ میں بیان ہوا ہے کہ مشکلات کے فوائد میں سے ایک فائدہ خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے، حدیث میں وارد ہوا ہے " لو لا ثلاثۃ ما طاطاء راس ابن آدم ، الفقر و الموت وا لمرض " (توحید صدوق / ۴۰۴) اگر فقر، بیماری اور موت نہ ہو تو کوئی بھی طاقت انسان کے سر کو خم نہیں

کر سکتی تھی اور وہ اسی طرح گردن کش اور مغرور رہتا. یقیناً خوشی اور رفاہ انسان کو بے ارادہ بنا دیتے ہیں. حضرت علیؑ فرماتے ہیں " جو درخت خشک صحراؤں کے دامن میں پرورش پاتے ہیں ان کی لکڑی مضبوط ہوتی ہے " (نج البلاغہ رنامہ ۴۵) اور شاید امام عسکریؑ کی مراد اس بات سے جو بیان فرماتے ہیں کہ بلاؤں میں خوبیاں ہیں (بحارج ۷۸ رص ۳۷۳ نقل از عدل از دیدگاہ تشیع) یہی ہو کہ بلائیں ایک طرف تو ہمارے اور خدا کے درمیان ارتباط برقرار کرتی ہیں اور دوسری طرف ہماری فکر کو کام جد و جہد و تلاش کی طرف مجبور بناتی ہیں. لہذا جو دباؤ بلاؤں اور مشکلات کی وجہ سے جسم پر پڑتا ہے اس کے بدلے میں روح کو قوت اور طاقت نصیب ہوتی ہے. مثلاً ایک مہمان نوازی میں میزبان زحمت میں پڑتا ہے لیکن اس کی شخصیت جو وہی روح سخاوت اور کمالات ہے رشد و نمو پیدا کرتی ہے اور ہماری مراد اس سے جو ہم کہتے ہیں کہ بلائیں شخصیت کے رشد اور خود سازی میں موثر ہیں یہی ہے.

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں " البلاء للظالم ادب و للمؤمن امتحانٌ و للاولیاء درجۃ " (بحارج ۸۱ / ۱۰۸) یعنی سختیاں ظالموں کیلئے خطرے کی گھنٹی اور مؤمنوں کیلئے امتحان کا باعث اور اولیاء خدا کیلئے درجات کی بلندی کا ذریعہ ہیں

فوجی ٹریننگ سنٹر میں کام کی سختی کیلئے تین عامل پائے جاتے ہیں:

۱۔ کبھی سپاہی کوئی غلط کام کرتا ہے تو اسکو سخت کام سونپا جاتا ہے جو اس جملے کا " البلاء للظالم ادبٌ " کا مصداق ہے.

۲۔ کبھی سپاہی کو ترقی دینے اور اس کے عمل اور استعداد کو رونق بخشنے

کیلئے " وللمؤمن امتحان " سخت کام سونپا جاتا ہے ۔

۳۔ کبھی یہ چاہتے ہیں کہ اس کے مقام اور رتبہ کو اور اونچا کریں ۔ یا اس کو کچھ مدت کے لیے چھٹی دیں تو کوئی سخت کام اس کے حوالے کرتے ہیں تا کہ درجے اور رتبے یا چھٹی کا حقدار بن سکے ، مذکورہ حدیث بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔

لہٰذا خدا کی عطا کردہ چیزیں کسی کی خوبی اور عزت و شرف پر دلیل نہیں ہیں کبھی بہترین اور پاکترین افراد سخت ترین مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تا کہ مردان حق ان مشکلات کے درمیان صیقل ہوجائیں اور اس طرح اپنے کمالات تک پہنچ سکیں کیونکہ جب تک اگربتی کے سر کو نہ جلائیں عطر انگیز خوشبو مشام تک نہیں پہنچ سکے گی ۔ ان نشیب و فراز کا ہونا تمام موجودات میں ان کے تکامل کی علامت ہے ۔ دھات جب تک بھٹی میں نہ پگھلائی جائیں قابل تصفیہ نہیں ہوتیں زمین میں جب تک ہل نہ چلایا جائے وہ زراعت کے قابل نہیں ہو سکتی ، گھاس جب تک بھیڑوں کے دانتوں میں بھوسا نہ بن جائے گوشت نہیں بن سکتی اور بھیڑ کا گوشت جب تک آگ پر پک نہ جائے اس وقت تک انسان کے کھانے کے قابل نہیں ہو سکتا اور انسان کے سلول میں تبدیل نہیں ہوسکتا ۔ لہٰذا انسان جب تک اس کا روان ہستی میں مشکلات سے دوچار نہ ہو اور سخت ترین بلاؤں کے ساتھ اپنے پنجے نرم نہ کرے اس وقت تک اس کی روح میں چمک دمک پیدا نہیں ہو سکتی اور وہ بہت سے کمالات تک نہیں پہنچ سکتا ہے ۔

ہماری انسانیت کھانے اور سونے سے نہیں ہے. کیونکہ حیوان بھی اس کام میں ہمارے شریک ہیں بلکہ ہمارا انسان ہونا ایسے بہت سے کمالات اور صفات کا حامل ہونے کی وجہ سے ہے، جیسے خدا کی طرف توجہ رکھنا، انسان دوستی، ایثار اور بخشش وغیرہ، اور ظاہر ہے کہ ان صفات کا پیدا ہونا مشکلات سے دوچار ہوئے بغیر امکان پذیر اور میسر نہیں.

انسان کے ایجادات میں مشکلات کا حصہ

کیا آپ نے کوئی چھوٹی سے چھوٹی ایجاد دیکھی ہے جو ضرورتوں اور مشکلات کے بغیر وجود میں آئی ہو؟ اگر یہ تمام درد نہ ہوتے تو دوا بنانے کا علم بھی نہ ہوتا. اگر سردی اور گرمی نہ ہوتی تو سردی اور گرمی کے وسائل بھی نہ بنائے جاتے. تمام علوم اور صنایع کی ترقی فوجی، صنعتی اور طبی شعبوں میں ضرورتوں اور سختیوں کے ساتھ مقابلے کے سائے میں وجود میں آئی ہے. اور یہ ایک حقیقت و واقعیت ہے جس کے لیے نہ تو وضاحت کی ضرورت ہے اور نہ استدلال پیش کرنے کی.

چھٹا نکتہ

انسان کو فیصلے اور قضاوت کے میدان میں صرف منفی سمت میں توجہ نہیں رکھنی چاہیے۔ ایک دانشمند کا کہنا ہے کہ جب کبھی کھٹا لیمو تمہارے ہاتھ آئے تو اس کو اس کی کھٹائی کی بنا پر دور نہ پھینکو بلکہ لیمو کی اسی کھٹائی سے لیمونیٹ بنا لو اور یہ حقیقت بتائی ہے کہ اس دنیا سے مثبت استفادہ کرنا چاہیے۔

یوسفؑ کو اس کے بھائیوں نے کنویں میں گرایا پھر ایک گروہ نے ان کو کنویں سے باہر نکال لیا اور غلام بنا کر بیچ دیا، اور مصر میں ان پر ناروا تہمت لگائی گئی پھر انھیں زندان میں ڈال دیا گیا، اور اس تمام داستان کے بعد وہ عزیزِ مصر بن گئے اور کچھ مدت کے بعد جب وہ باپ کی ملاقات سے شرفیاب ہوئے اور ان کے والد بزرگوار نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارے بھائیوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟

تو یوسفؑ نے عرض کی بھائیوں کے کام کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کریں بلکہ خدا کے لطف کے بارے میں سوال کریں کہ اس نے کس طرح مجھے ان تمام، مکر و فریب و غلامی و تہمت، اور قید خانے میں محفوظ رکھا اور ان سب پر قدرت اور غلبہ عطا کیا۔

یہ خود، ایک قسم کی منطق ہے کہ انسان ہمیشہ منفی سمت میں توجہ نہ کرے

بلکہ اس کے مثبت پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھے ایک حدیث جو امام حسن عسکریؑ سے نقل ہوئی ہے اس کو ہم بھول نہ جائیں۔ آپ نے فرمایا ما من بلیّة الا و لله فیها نعمة تحیط بها (بحار، جلد ۷۸، صفحہ ۳۷۴ بہ نقل از عدل از دیدگاہ تشیع) یعنی کوئی بلا ایسی نہیں ہے جس کے اندر خدا نے نیکی نہ رکھی ہو اور وہ نیکی اس بلا پر محیط ہے۔ لوگوں کا اعتراض خدا کے عدل پر اس وجہ سے ہے کہ وہ مسائل کو ایک زاویہ اور ایک نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ایک مثال ایک دانشمند سے نقل کر رہا ہوں،

سورج چمکتا ہے اور سمندر سے بھاپ اٹھتی ہے، اور بھاپ سے بادل اور پھر بادلوں سے بارش برسنا شروع جاتی ہے اور زمین کی کشش بارش کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بارش کے قطرات زمین میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ان سے نہریں وجود میں آتی ہیں انسان ایک بند بنا کر پانی کو روکتا ہے، اس سے بجلی پیدا کرتا ہے۔ پھر اس طرح زراعت کو وسعت دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص غفلت یا نادانی کی وجہ سے بجلی کے تار کو پکڑلے اور مر جائے یا اگر زراعت اور کھیتی کی راہ میں کسی چیونٹی کا گھر خراب ہو جائے، کیا آپ اس انسان اور اس چیونٹی کو اعتراض کرنے کا حق دیں گے؟ کیا آپ اس بات کی اجازت دیں گے کہ وہ شخص "اڈیسن" پر اعتراض کرے کہ اس نے کیوں بجلی کو بنایا اور قابل استفادہ قرار دیا؟ کیا چیونٹی سورج مردہ باد، دریا مردہ باد، بادل و بارش، انسان، وزراعت مردہ باد کا نعرہ لگانے کا حق رکھتی ہے کہ انھوں نے میرے گھر کو کیوں خراب کیا؟

کیا ان اعتراضات کے نمونے ایک قسم کی خود خواہی و جاہ طلبی کی وجہ سے نہیں ؟ کیا اعتراض کے یہ نمونے اس وجہ سے نہیں ہیں کہ ہم مسائل کو صرف ایک زاویے سے دیکھتے ہیں اور صرف ایک ہی مدار میں فکر کرتے ہیں ؟ اور اس مدار کے مرکز کو بھی ہم اپنا شخصی ذاتی و منافع سمجھتے ہیں ؟

گویا پوری کائنات میرے شخصی آرام اور ذاتی خواہش کے مطابق حرکت میں ہونی چاہیے . وہ بھی میرے موجودہ شخصی منافع کے مطابق . کیونکہ کبھی مشکلات میرے آئندہ کے لیے ٹھیک ہیں . لیکن جب تک نتیجہ آج ہی اور فوری طور پر نہ ہو ہم راضی نہیں ہوتے ہیں !

ایک دوسرا بیان

مشکلات کے سلسلے میں خداوندعالم کے عدل سے متعلق دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم میں اس عالم ہستی میں دو نظریوں میں سے ایک کو قبول کرنا چاہیے ، یا ہمیں دنیا کے لیے کسی نظام اور حساب و کتاب کو قبول کرنا چاہیے یا پھر حرج و مرج اور بد نظمی کو .

اگر عالم ہستی کسی ، نظام ، حساب اور فارمولے کے تحت ہے تو اس میں مشکلات بھی ہونا چاہیے وگرنہ ، ہرج و مرج اور بد نظمی کے پیچھے جانا چاہیے . تھوڑی سی وضاحت کے ساتھ اگر آپ کسی تخ حادثہ کی تحقیق کریں تو دیکھیں گے کہ اس کو دقیق فارمولے اور حساب و کتاب وجود میں لائے ہیں اور اس حساب کا قبول کرنا ان مشکلات کو تحمل کرنے کے برابر ہے . مثلاً ایک مکان کچھ لوگوں کے سر پر

گرجاتا ہے اور ہم اس حساب اور تحقیق میں لگ جاتے ہیں کہ اس کی خرابی کا باعث کیا ہے ؟

۱ ۔ بچوں کی وہ گیند جو گلی میں کھیلتے وقت ، پڑوسی کی چھت پر چلی گئی .

۲ ۔ گول گیند گھوی اور ناودان کے سوراخ میں جا پڑی اور بارش کے پانی کے راستے کو اس نے بند کردیا .

۳ ۔ بارش ہوئی اور پانی چھت پر جمع ہوگیا اور گھر کا مالک بھی اس واقعہ سے بے خبر تھا .

۴ ۔ بارش کے پانی نے چھت میں اثر کیا اور اینٹوں کو نرم کردیا .

۵ ۔ گھر کا مالک چھت کے نیچے آرام سے سویا ہوا تھا اور اینٹوں کی چھت جو بارش کے پانی سے سنگین ہوگئی تھی گرگئی اور کچھ لوگ اس کے نیچے دب کر مر گئے .

حساب کے مطابق اس قسم کے حوادث پیش آنے چاہیں کیونکہ خود گیند اور اس کا گھومنا اور چھت کی نشیبی حالت و ناودان کے سوراخ کا تنگ ہونا ، پانی کا وزن اور دباؤ ، اینٹوں کی طاقت ، چھت اور اس کے نیچے سوئے ہوئے کے سر کے درمیان فاصلہ اور بدن کی ہڈیوں کی ساخت ، سب ایک نظام ، حساب اور فارمولے کے تحت ہیں . اگر آپ حساب شدہ اور منظم دنیا کے طرفدار ہیں تو آپ اس حادثہ کو گھر والوں کیلئے قبول کیجئے . کیونکہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ مشکلات پیش نہ آئیں ، تو بد نظمی و ہرج و مرج ہونا چاہیے اور پہلے کے تمام حساب و کتاب

ختم ہوجانے چاہیں مثلاً :

۱ ۔ بچوں کی گیند اتنی وزنی ہو کہ پڑوسی کی چھت تک نہ پہنچ سکے ۔

۲ ۔ یا بچوں کے بازو گیند پھینکنے میں کمزور اور طبیعی حالت سے خارج ہو جائیں ۔

۳ ۔ یا پڑوسی کے گھر کا ناودان اتنا بڑا ہوتا کہ گیند آسانی کے ساتھ اس میں سے نکل جائے ۔

۴ ۔ یا وہ قوانین اور فارمولے جو اس رات بارش برسنے کا باعث ہوئے ان سب کو ختم کیا جائے تاکہ بارش نہ برسے ۔

۵ ۔ یا پانی اپنی طبیعی خاصیت کو کھو دے اور اینٹ میں اثر نہ کرے ۔

۶ ۔ یا تمام کچی اینٹیں پکی اینٹوں میں بدل دی جائیں تاکہ ان میں پانی اثر نہ کرے ۔

۷ ۔ یا زمین کی قوت جاذبہ اس رات ٹھہر ہو جائے اور پانی سے گیلی چھت کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے ۔

۸ ۔ یا چھت کے نیچے سونے والوں کی ہڈیاں اس قدر مضبوط اور سخت ہو جائیں کہ چھت کا گرنا ان پر اثر نہ کرے یا گیلی اور وزنی چھت مثل روئی کے ایک ہلکی سی چیز میں تبدیل ہو جائے !

آپ نے ملاحظہ فرمایا لیا کہ اگر ہم نظام وحساب کے طرفدار و حامی ہیں اور علل و معلول کے مدار پر حرکت کریں تو اس صورت میں مشکلات ایک طبعی

زندگی کا لازمہ ہیں جب کہ ایک مشکل کو محو کرنے کیلئے دسیوں قوانین اور فارمولوں کو مٹانا پڑے گا جو خدائے حکیم کے ہاتھوں سے عالم ہستی میں قرار دیے گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ اگر یہ دنیا نظم و حساب رکھتی ہے تو بلا و مشکل بھی رکھتی ہے اور اگر یہ طے پا جائے کہ بلا نہ ہو تو حساب بھی نہیں ہونا چاہیے اور پھر بدنظمی و ہرج و مرج خود تمام بلاؤں سے بالاتر اور بدتر بلا ہے۔

ضروری توجہ

عدل الٰہی کے بارے میں بحث اور صلاحیتوں کے تفاوت و فرق کے ساتھ اس نکتہ پر توجہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو کم استعداد سمجھتے ہیں ممکن ہے بہت سے دوسرے شعبوں میں ذوق و استعداد رکھتے ہوں۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو لالچ و ہوس یا درآمد یا رقابت کی خاطر کسی کام یا ہنر کی تلاش میں جاتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو ناکام و شکست خوردہ پاتے ہیں اس کے بعد وہ کائنات کو برا بھلا کہتے ہیں۔ وہ لوگ ایک مسئلہ بن جاتے ہیں دوسرے لوگ بھی ان کو بے لیاقت سمجھتے ہیں ہر طرف سے اس کو ذلیل کرتے ہیں بہت ممکن ہے کہ یہی شخص دوسرے شعبوں میں قابل تحسین اور موجد و کامیاب بن جائے۔ کہتے ہیں کہ "ڈارون" کا باپ ڈاکٹر تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کا لڑکا بھی اس کے ساتھ تعاون کرے لیکن ڈارون ڈاکٹری کے شعبے میں کامیاب نہیں ہو سکا اس کا باپ ناراض ہو گیا اور اس کو مذہبی اطلاعات حاصل کرنے کے شعبے میں

کام کرنے کیلئے چھوڑ دیا، تا کہ عیسائیت کیلئے ایک بہترین کشش اور روحانی (عالم) بن سکے۔ لیکن اس شعبے میں بھی وہ ناکام رہا۔ ڈاروِن دو ناکامیوں کے بعد علوم طبیعی کے شعبہ میں مشغول ہوگیا اور اس شعبے میں صاحب علم اور کامیاب بن گیا (۱)"

ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ اگر تم کو کسی کام میں ناکامی ہوتی ہے تو فوری طور پر کام کو بدل دو۔ بہت قوی امکان ہے کہ دوسرے شعبہ میں صاحب امتیاز اور صاحب کمال ہو جاو۔ حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں ایک بہترین مطلب کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ ہر کمال کے ساتھ ایک عیب اور ہر عیب کے ساتھ ایک کمال ہے۔ بعض لوگ قد کے اعتبار سے اونچے ہوتے ہیں لیکن ہمت کے اعتبار سے کم ہمت ہوتے ہیں «مادّ القامة قصیر الھمة» بعض لوگوں کی شکل و شباہت بری معلوم ہوتی ہے لیکن عمل اور بیان کے اعتبار سے اچھے ہوتے ہیں "زاکی العمل قبیح المنظر" بعض کا بیان سلیس لیکن وہ دل کے سخت ہوتے ہیں «طلیق اللسان حدید الجنان» لہذا نہ ہر کامیاب انسان تمام شعبوں میں کامیاب ہے اور نہ ہر ناکام انسان تمام کاموں میں ناکام ہوتا ہے (نہج البلاغہ فیض الاسلام ص ۱۱۷۱ - ۱۱۷۲)

بعض افراد ہیں جو رقابت کی بنیاد پر کسی شعبے میں کام کرتے ہیں (جب کہ کبھی روحی طور پر اور ذوق کے لحاظ سے اس کام کے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ہیں)۔

۱۔ البتہ ممکن ہے کہ ہر صاحب نظر پر اعتراضات علمی ہوں لیکن یہ چیز اس میں نبوغ اور اختراع کی وجود سے مانع نہیں ہے

اور ناکامی سے دوچار ہوجاتے ہیں پھر خدا کے عدل پر اعتراض کرتے ہیں کہ اے خدا فلاں شخص کیوں کامیاب ہوگیا اور میں کیوں ناکام۔ لیکن اگر وہ کسی دوسرے شعبے (جو اس کے حوصلے اور ذوق کے ساتھ میل رکھتا ہو) میں کام کرتا ممکن تھا اس کو اس میں زبردست کامیابی نصیب ہوجاتی. لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہی شخص ناکام ہوتا ہے جسنے ابھی تک ایسے شعبے میں جس کو اس نے انتخاب کیا ہے. اپنی روحی آمادگی و صلاحیت اور ذوق کو پہچانا نہیں ہے اور وہ لوگ جو تصور کرتے ہیں کہ وہ کامیاب ہیں اگر غور کریں تو مختلف قسم کی کمزوریاں و ناکامیاں اور عیوب ان کی کامیابیوں کے پہلو میں دکھائی دیتے ہیں. عدل خدا کے مسئلہ کے اختتام پر کچھ اور دوسرے سوال بھی پیش آتے ہیں.

پہلا سوال

کیا شیطان کا پیدا کرنا خدا کے عدل و حکمت کے ساتھ میل کھاتا ہے؟

کیا انسان کی خلقت سے خداوندعالم کا مقصد عبادت نہیں تھا. کیا شیطان کا پیدا کرنا اس مقصد کے برخلاف نہیں ہے. ان سب کے باوجود انسان بڑی زحمت کے ساتھ ایک عمل انجام دیتا ہے لیکن مختلف قسم کے گناہ و وسواس اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ یہ اعمال حسین طریقوں سے خراب ہوجائیں، یا ابتدا ہی سے دکھاوے اور ریا کی وجہ سے خالص شکل اختیار نہیں کرتے یا عمل کے وسط میں غرور اور تکبر اس عمل کو بے اثر بنادیتا ہے یا عمل کے بعد کچھ گناہوں کی وجہ سے سب اعمال ضائع و برباد ہو جاتے ہیں لہذا کیا شیطان کی پیدائش خدا کی حکمت اور

عدل کے برخلاف نہیں ہے ؟

جواب

جو وجود اور امکانات خدا نے شیطان کو دیئے وہ سب کے سب نیک تھے اور وہ بھی کئی سال تک عبادت میں مشغول رہا[1] . اور اس کی برائی خدا کے فرمان سے اس کی سرکشی کی وجہ سے تھی لیکن سرکشی کے گناہ سے بھی تر یہ کہ اسنے توبہ اور معذرت خواہی بھی نہیں کی اور پشیمان بھی نہیں ہوا اپنے غرور اور تکبر کی وجہ سے اس نے حکم خدا کو غلط سمجھا، اس نے کہا یہ حکم صحیح نہیں ہے کیونکہ میری خلقت آگ سے ہوئی ہے اور آدم کی خلقت خاک سے ہے لہذا آگ کو خاک پر برتری حاصل ہے پس شیطان کا غرور اور اس کی سرکشی خود اس کی ذات سے مربوط ہے نہ خدا سے البتہ اس کے وسواس ایسے نہیں ہیں جو ہم کو گناہ پر مجبور کریں و سوسہ کا کام ایک حد تک دعوت کرنا ہے لیکن ہمارا عزم ارادہ وسوسوں کے ذریعہ برباد نہیں ہونا اور ممکن ہے یہ وسوسے مثبت پہلو بھی رکھتے ہوں کیونکہ ہمارا ارتقا صرف اندرونی میلانات اور شیطانی و سوسوں کے ساتھ مخالفت کی صورت میں نکھرتا ہے ۔ اگر کوئی شخص گونگا ہو اور غیبت نہ کرے اس کی روٹی قیمت نہیں ہے اگر وسوسہ اور میلانات نہ ہوں تو انسان کا اچھا ہونا کوئی وقعت نہیں رکھتا ، ہم خود ایسے شخص کو پہلوان کا لقب دیتے ہیں جو بھاری وزن کو اپنے ہاتھ پر اٹھالے کیونکہ

---

[1] حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں کہ ابلیس نے چھ ہزار سال تک خدا کی عبادت کی ۔ (صبحی صالح ، ص ۲۸۷)

یہ عمل زمین کی قوت جاذبہ کے بر خلاف ہے، ہاں اس طرح پہلوان کی پہچان کشش اور جاذبہ کے بر خلاف عمل کرنا ہے، پیغمبر اکرم فرماتے ہیں اگر غصہ نے تمہیں کسی سمت کھینچنا چاہا اور تم نے اپنے آپ کو کنٹرول کر لیا (معنوی اور انسانی میدان میں) تو پہلوانی کے مقام تک پہنچ گئے ان سب کے باوجود اگر کوئی شخص وسوسوں کے مقابلے میں تسلیم ہو جائے تو اس کے لئے توبہ، معذرت خواہی اور آخری فیصلہ کا راستہ کھلا ہے اور وہ توبہ کرسکتا ہے۔

بالفرض اگر شیطانی وسواس اور ہم تنہا ہوتے، تو اعتراض کا موقع تھا لیکن اس کے وسوسوں کے مقابلے میں انبیاء کی دعوت اور عقل کی ہدایت و راہنمائی بھی ہے اور عقل صراط مستقیم پر چلنے کے سلسلے میں ہماری بہترین مددگار ہے، یہ تمام باتیں ایک طرف، دوسری طرف یہ کہ شیطانی وسوسے خود ہمارے انحرافات کے پیچھے کارفرما ہیں ایسا نہیں ہے کہ وہ ہم کو اپنے پیچھے کھینچتا ہو بلکہ ہم اس کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں لہذا قرآن میں اس ہوس پرست دانشمند کی داستان میں ارشاد ہوتا ہے۔ واتل علیهم نبا الذی اتیناه آیاتنا فانسلخ منها فاتبعه الشیطان فکان من الغاوین) (سورہ اعراف/ ۱۷۵) .

اس شخص کی داستان کو لوگوں کے سامنے بیان کرو جسے ہم نے اپنی آیات کو یاد دلایا لیکن اس نے ان کو چھوڑ دیا اور شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا پھر وہ ضلالت میں مبتلا و گمراہ ہو گیا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ایسے لوگوں کے پاس آتا ہے جو

برے اعمال کے ذریعہ اپنی آمادگی کا اظہار کرتے ہیں یہ آیت بلعم باعور نامی شخص سے متعلق ہے جو بنی اسرائیل میں سے تھا خداوند عالم نے اس کو ایسی چیزیں تعلیم کر رکھی تھیں جن کی وجہ سے اس کی دعا قبول ہوتی تھی لیکن اسکے اندر فرعون کے دربار کی طرف جھکاو پیدا ہوا اور مال و مقام کی ہوس اس بات کا باعث بنی کہ وہ خدا کے عطا کردہ علوم اور آیات سے جدا ہو گیا اور شیطان نے اس کو دبوچ لیا۔ ایک دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں (انماسلطانه علی الذین یتلونه) (سورہ نحل / ۱۰۰)

شیطان کا تسلط اور غلبہ صرف ان لوگوں پر ہے جو اس کو اپنا دوست اور سرپرست قرار دیتے ہیں اگر ہمارے اندر اس کی پیروی کا جھکاو پیدا نہ ہو تو وہ ہرگز ہماری رہبری کو اپنے دوش پر نہیں لیتا ہے، لہذا ارشاد ہوتا ہے -انه لیس له سلطان علی الذین امنوا و علی ربهم یتوکلون) (سورہ نحل / ۹۹) بیشک شیطان مومنین اور ان لوگوں پر جو خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں کوئی تسلط و غلبہ نہیں رکھتا ہے البتہ تسلط نہ رکھنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ حتی وسوسہ بھی پیدا نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ سچے مومنین شیطان کو پہچانتے ہیں کیونکہ جب وہ اس کے وسوسوں سے روبرو ہوتے ہیں قبل اس کے کہ وہ ان میں نفوذ اور ان پر تسلط پیدا کرے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ قرآن کو شیطان کے ساتھ مومنین کی روش کو اس طرح بیان کرتا ہے «ان الذین اتقوا اذا مسّهم طائف من الشیطان تذکروا» (اعراف / ۲۰۱) بیشک وہ لوگ جو پرہیز گار ہیں جب انھیں شیاطین کا ایک گروہ مس کرنے اور

چھونے کی کوشش کرتا ہے تو وہ آگاہ ہو جاتے ہیں . اور اپنے کو بچالیتے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ مومن کا رابطہ شیطان سے روش و رفتار کا رابطہ ہے ، لیکن فاسق کا رابطہ شیطان کے ساتھ ایسا ہے جیسے انسان کا رابطہ انسان کے ساتھ «ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطانا فهو له قرین» (سورہ زخرف آیہ ۳۶) جو شخص خدا کی یاد سے اعراض کرے ہم ایک ایسا شیطان اس کے لئے قرار دیتے ہیں جو اس کا یار اور ہمنشین ہو مختصر یہ کہ شیطان ایک ایسا وجود اور ایک ایسی شئے ہے جو خدا کے عطا کردہ امکانات سے بہترین فائدہ اٹھاسکتا تھا لیکن غرور اور تکبر کی وجہ سے اسنے اپنے آپ کو خراب کردیا اور یہ بات خود اس کی ذات سے مربوط تھی شیطان کے وسوسے بھی ہمارے انحراف کے متعلق جبر و بے تو جہی کا سبب نہیں ہوتے ، کیونکہ دھوکے اور فریب میں آنے والوں کیلئے توبہ کا دروازہ بھی کھلاہے اور اس کے نفوذ پیدا کرنے کی راہیں ہموار کرنا بھی خود ہمارے ہاتھ میں ہے، ان مطالب کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شیطان کا پیدا کرنا خدا کے عدل کے خلاف ہے .

ایک اور سوال

خدا کے عدل کی بحث میں ایک مطلب جس کے بارے میں بہت پوچھاجاتا ہے وہ ناقص و معیوب پیدا ہونے والے افراد کا ہے، لوگ پوچھتے ہیں ، ؟ اگر خدا عادل ہے تو یہ تمام افراد جو ناقص الخلقت ہیں جو عمر بھر رنج اٹھاتے ہیں اور لوگ ان کی اہانت کرتے ہیں یہ کس لئے ہے ؟

جواب

اس سوال کا جواب گذشتہ بحثوں سے پیدا کرسکتے ہیں، ہم نے بیان کیا ہے کہ بہت سی پریشانیوں کو وجود میں لانے کا باعث ہم خود ہیں۔ ناقص پیدا ہونے والے افراد بھی ہماری غفلت کا نتیجہ ہیں والدین کو چاہیے کہ وہ حفظان صحت کے مسائل کی رعایت کریں ان کی غفلت کی وجہ سے بچہ ناقص پیدا ہوتا ہے، خوش بختی سے ائمہ معصومینؑ کی روایات میں ان مسائل کی طرف پوری توجہ رہی ہے کہ نشہ، حیض، بیہوشی یا خوف کی حالت میں جماع کرنے سے بچے پر برے اثرات پڑتے ہیں اس امید کے ساتھ کہ ہمارے بھائیوں اور بہنوں کیلئے ایسی کلاسیں منعقد کی جائیں جس میں اسلامی وظائف، ایک دوسرے کے حقوق، فرزند کی تربیت، جنسی مسائل اور اسلام کے احکام پڑھائے جائیں۔

یہاں پر ایک سوال پیش آتا ہے کہ:

بچے کا گناہ کیا ہے؟

اس سلسلے میں ہمارا جواب صرف ایک ہی جملہ ہے وہ یہ کہ خدا کا گناہ کیا ہے؟ یہاں بچہ بھی بے قصور اور خدا بھی منزہ و مبرہ ہے۔ فقط والدین کا قصور ہے لیکن اس کا رنج بچے کے دوش پر ہے اور یہ بات بچے ہی سے مخصوص نہیں ہے دنیا کے تمام مظالم میں قصور ظالم کا ہوتا ہے لیکن ظلم کا رنج مظلوم کو اٹھانا پڑتا ہے۔

اگر میں آپ کی طرف ایک پتھر پھینکوں اور اس سے آپ کی پیشانی زخمی ہو جائے اس میں نہ آپ کا قصور ہے نہ خدا کا، یہ میرا قصور ہے کیونکہ میں نے پتھر

پھینکا ہے لیکن میرے گناہ اور قصور کا رنج آپ برداشت کررہے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ یہ سوال جو ہوتا ہے کہ والدین تقصیر کریں بچہ کا کیا گناہ ہے ؟ یہ ان سوالوں کے مانند ہے جو تمام مظالم میں ہوتے ہیں کہ ظالم قصوروار ہے مظلوموں کا گناہ کیا ہے ؟ اگر آپ تلخ یا نمکیں آٹے کو نانوائی کے پاس لے جائیں اور وہ آپ کو تلخ یا نمکین روٹی بنا کر دیدے کیا آپ کہیں گے کہ نانوائی ظالم ہے ؟ اگر آپ تربوزہ کا بیج بوئیں اور تربوزہ ہی اگائیں تو اس میں کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

اگر آپ جنوب کی سمت راستہ طے کریں تو کیا آپ کو شمال کی طرف پہنچنے کی توقع رکھنا چاہیے ؟

ہر غذا اور جذبہ ذاتی اور طبعی آثار کے حامل ، ہیں اور ان سے فرار طبیعی موجودات کے تمام قوانین کے باہم ٹکراو کے برابر ہے لہذا ہر ایک بیج کا ایک پھل، اور ہر ایک نطفہ کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے خلاف توقع رکھنا غلط ہے، لیکن یہ سوال جو کرتے ہیں کہ والدین کی کوتاہی وقتی طور پر تھی اور اس ناقص بچے کا رنج دائمی ہے پھر بھی یہ چیز خدا سے مربوط نہیں ہے آپ ایک منٹ میں اپنی آنکھ میں چاقو مارتے ہیں اور ستر سال کے لئے نابینا ہو جاتے ہیں گناہ ایک منٹ میں ہوا اس کا اثر ستر سال تک باقی ہے یا دائمی ہے کچھ لمحوں میں آپ ایک پتھر شیشے پر مارتے ہیں شیشہ ہمیشہ کیلئے ٹوٹ جاتا ہے نفسیاتی و اعصابی مسائل بھی اسی طرح کے ہیں آپ ایک گالی کسی شخص کو دیجئے آخر عمر تک آپ کی دوستی و

محبت کا رشتہ ٹوٹ جائے گا جس طرح چند منٹ کی عذر خواہی کے ذریعہ کئی سال کے دشمنی کو بے اثر کر سکتے ہیں۔ کلمہ "حبط" کے سلسلے میں توحید کی بحث میں ، میں نے بیان کیا ہے اور مثال دی ہے کہ انسان ایک عمر تک حفظان صحت کے اصول کی رعایت کرتا ہے لیکن زہر کا ایک چمچہ ان سب کو بے اثر کر دیتا ہے یہاں پر ایک سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ والدین نہیں جانتے تھے کہ یہ عمل فلاں شرائط میں بچے پر برے اثرات مرتب کریگا ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ماں باپ کا جاننا یا نہ جاننا طبیعی اشیاء کی خاصیت میں اثر نہیں رکھتا ، ہم اگر نہ جانیں کہ فلاں تار میں بجلی ہے اور اس کو پکڑ لیں بجلی تو ہم کو مار ہی دے گی ، بجلی صبر نہیں کریگی تا کہ یہ دیکھ لے کہ اگر ہم نہیں جانتے تو وہ ہمیں چھوڑ دے ہم اگر شراب کو پانی کے خیال سے پی جائیں تو مست ضرور ہو جائینگے کیونکہ مست ہونا شراب کے طبیعی آثار میں سے ہے چاہے ہم یہ خیال کریں کہ پانی ہے یا کوئی دوسری چیز : لہذا ماں باپ کی بے تقصیری کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے عمدا گناہ نہیں کیا لیکن طبیعی اور وضعی آثار (بدستور) اپنی جگہ پر محفوظ ہیں۔

اور یہ سوال کہ لوگ ناقص الخلقت افراد کی توہین اور مذاق اڑاتے ہیں تو یہ بات ظاہر ہے کہ لوگوں کی توہین خود ان کی ثقافت و تہذیب سے مربوط ہے نہ کسی دوسرے سے اور نہ خدا سے ، ہمیں ناقص پیدا ہونے والے لوگوں کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے اس سلسلے میں اسلام کے مقدس آئین میں خاص طور

پر سفارش کی گئی ہے ، آخری مسئلہ جو حکومت اسلامی کی مسئولیت و ذمہ داری سے مربوط ہے وہ یہ ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کے مخارج محترمانہ طور پر پورا کرے اور ہر ایک کیلئے ان کی اپنی طاقت ، ذوق اور استعداد کے مطابق آسان کام فراہم کرے اور ان کے آرام کیلئے مناسب آمدنی کا اقدام کرے ، اس طرح کافی حد تک ان بھائیوں اور بہنوں کے غموں کی تلافی کرے ہم اس بحث کو یہاں پر ختم کررہے ہیں اور قارئین محترم سے کچھ تقاضے کرتے ہیں ،

پہلا تقاضا :۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے عقیدے اور فکری مسائل میں (جو وہی اصول دین اور ہمارے اعتقادی مسائل ہیں کہ تحقیق اور سرسری یا عمیق استدلال کے ساتھ) کسی قسم کا شک و تردید نہ رکھیں اور جب کبھی کوئی اعتراض پیش آئے تو ایک اسلام شناس سے فوراً پوچھ لیں ہمیں کارخانے ، ادارہ ، یونیورسٹی ، بازار ، مدرسہ ، دیہات یا ضلع کے ٹیلیفون نمبروں کے ساتھ جہاں کہیں ہم ہوں ایک یا چند دانشوروں کے ٹیلیفون نمبر بھی رکھنا چاہیے کیونکہ جس طرح بلیڈ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اگر پاؤں میں چلا جائے تو وہ انسان کو چلنے سے روک دیتا ہے اور زندگی کو تلخ و دشوار بنادیتا ہے یوں ہی کبھی ایک چھوٹا سا اعتراض بھی ہماری عقل میں بیٹھ جاتا ہے جو ہمیں غور و خوض کرنے اور خوش بین ہونے سے روک دیتا ہے اور زندگی کو ہمارے لیئے ناگوار بنادیتا ہے بالخصوص وہ نوجوان جو اس زمانے میں مختلف قسم کے اعتراضات سے دو چار ہوتے ہیں ان کے لیئے ضروری ہے کہ وہ ایک متقی اور دانشمند انسان سے رابطہ رکھیں تمام دوستوں سے ہمارا یہ تقاضا ہے ۔

ایک بہترین سرگذشت

طاغوت کی حکومت میں بعض ایسے دوستوں سے میری ملاقات ہوئی جو کہتے تھے کہ اسلام کے قوانین موجودہ تمدن کی روح کے ساتھ ساز گار نہیں ہیں کیونکہ اسلام کہتا ہے چور کی چار انگلیاں کاٹنی چاہیں لیکن مارکسزم کہتا ہے کہ اگر ہم نے چور کے شکم کو سیر کردیا اور اقتصادی سیسٹم کو بدل دیا تو چوری خود بخود ختم ہو جائیگی ؛ میں جونہی ان کے ساتھ گفتگو کرنے بیٹھا معلوم ہوا کہ ایک مارکسٹ استاد کی بات انھیں بتائی گئی ہے انھوں نے درس کے ماحول میں اس بات کو سنا اور اس کو جذب کرلیا، میں نے عرض کیا کہ آپ کچھ جانتے ہیں کہ اسلام ہر چور کے ہاتھ نہیں کاٹتا بلکہ تقریبا بیس شرطیں ہاتھ کاٹنے کیلئے اسلام میں مقرر ہوئی ہیں اب بتائیں آپ میں سے کون ان شرائط کے بارے میں جانتا اور اطلاع رکھتا ہے ؟ سب نے کہا کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں . میں نے کہا اگر آپ کو معلوم ہوتا اور اسلام کے مسائل سے آپ آگاہ ہوتے تو کلاس میں کھڑے ہوجاتے اور اپنے معلم (استاد) سے کہتے کہ وہ اسلام جو چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا ہے اس نے تقریبا بیس(۲۰) شرطیں بھی مقرر کی ہیں اے استاد آپ ان شرائط سے آگاہ نہیں ہیں مہربانی فرماکر اسلام کے مسائل میں مداخلت نہ فرمائیں یا کم از کم اس کو آزادانہ بحث کی دعوت دیتے یا ٹیلیفون کے ذریعہ ان شرائط کو ایک عالم سے سوال کرتے اور اسلام عزیز کی حمایت کرتے پھر کچھ شرائط میں نے انھیں بتائے . وہ لوگ متوجہ ہوگئے پھر ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے ؛ محترم قاری ! قرآن کے متعدد

وعدوں کے مطابق آخری کامیابی اسلام کی ہے مستقبل میں پوری دنیا کے لوگ اسلام کی طرف بڑھیں گے اور حضرت مہدی (عجل اللہ فرجہ الشریف) کی حکومت تشکیل پائے گی۔

اور یہ وعدے کچھ شرائط کے ساتھ ہیں،

۱۔ دنیا کے لوگوں کی توجہ اسلام کی طرف۔

۲۔ اسلام کی پہچان۔

۳۔ اسلام کی طرف جھکاؤ۔

ہمارے شہدا نے اسلامی انقلاب میں لوگوں کی توجہ اسلام کی طرف کردی اور پہلا قدم آہستہ آہستہ اٹھایا جا چکا۔

اب ہماری باری ہے کہ ہم دوسرا قدم اٹھائیں اور وہ اسلام کو پہچاننے اور اس کو پہچنوانے کا ہے، اور تیسرا قدم خود دنیا کے لوگوں سے مربوط ہے جو تمام مذاہب کی شکست اور ناکامی کے بعد اسلام کی طرف رخ کریں گے۔

لہٰذا ہمیں ہفتہ میں کم از کم ایک مفید کتاب ضرور پڑھنی چاہیے تاکہ دن بدن ہماری اسلامی معلومات میں اضافہ ہو امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر لوگ ہمارے مکتب، راہ اور بات سے آشنا ہو جائیں تو وہ ہماری طرف رغبت اور جھکاؤ پیدا کریں گے۔ کتابوں کے مطالعات کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اعتقادی اور آئیڈیالوجی کی کتابوں کو غور سے پڑھنا ہے۔ کیونکہ ہمارے اعمال کی بنیاد ہماری فکر ہے اور ہمیں مضبوط و محکم استدلال اور فطرت کی راہنمائی کے مطابق تمام

مکاتب فکر کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی راہ کو انتخاب کرنا چاہیے آخر میں عدل الٰہی کے سلسلے میں ایک اور مطلب کی طرف اشارہ کرنا ہوں اور وہ یہ ہے کہ :

تفاوت اور فرق خدا کو پہچاننے کا راز ہے

جس طرح تبعیض و طبقہ بندی ظلم ہے اسی طرح حکیمانہ تفاوت [۱] عین عدالت بھی ہے اور خدا شناسی کا راز بھی ، قرآن کریم سورۂ روم میں فرماتا ہے (ومن آیاته خلق السموت و الارض واختلاف السنتکم والوانکم) یعنی زبانوں میں اختلاف اور فرق اور رنگوں کا گوناگوں ہونا خدا کی قدرت کی علامت ہے .

اگر ایک نقاش ہمیشہ ایک ہی قسم کا نقشہ کھینچے ، معمار اور انجینئر عمارت کا ایک ہی قسم کا نقشہ بنائے شاعر ایک ہی قسم کے اشعار بیان کرے تو یہ انکی کمزوری اور محدودیت کی دلیل ہوگی لیکن اگر ہر روز اور ہر ساعت وہ جدید اور نئی چیزیں پیش کریں تو یہ ان کی توانائی کی دلیل ہو گی .

۱۔ تبعیض اور تفاوت کے درمیان فرق کو ہم نے بیان کیا کہ تبعیض یعنی موجودات اورافراد کے درمیان مساوی شرائط میں فرق رکھنا اور یہ ظلم ہے لیکن تفاوت مختلف شرائط سے مربوط ہے مثلا ایک کلاس کے تمام بچوں نے مساوی طور پر استاد کے سبق کو یاد کیا لیکن معلم غیر دیتے وقت فرق رکھے یہ تبعیض اور ظلم ہے لیکن اگر استاد کے نمبرات کا فرق بچوں کی درسی سے معلومات کی بنا پر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے .

سماجی انصاف

سماجی انصاف کا معنی

مقدمہ :-

چونکہ گذشتہ حصے میں ہم نے خدا کے عدل کے بارے میں گفتگو کی ہے ، لہذا اس حصہ کو ہم سماجی انصاف سے اختصاص دینگے اور اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ بحث کا سلسلہ کافی وسیع ہے کچھ مطالب کو ہم نے خلاصہ کے طور پر قرآن مجید ،نہج البلاغہ اور روایات سے جمع کیا ہے اور ہر آیت اور حدیث کے متعلق تھوڑی سی وضاحت بھی بیان کی ہے اس حصہ کے مطالب ہمارے مکتب فکر کو واضح کرنے والے بھی ہیں اور مفید عام بھی.

سماجی انصاف ہمارا مقصد ہے

ہمارا مقصد سماجی انصاف کی بحث سے بعض آیات و روایات کا بیان کرنا ہے جن میں قرآن کریم اور آئمہ معصومینؑ نے حقوق کے تحفظ کا اور قانون کے مقابلے میں تمام لوگوں کا مساوی ہونا نیز تبعیض و، استثمار ، و ظلم کی نفی کا حکم دیا گیا ہے اور بیت المال کی عادلانہ تقسیم کے سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ معصومینؑ کی روش کے چالیس واقعات سے زیادہ کا بیان اور اسلامی برادری و اخوت کے بہت

سے نمونے بھی موجود ہیں۔

عدل تمام منصوبوں کا تانا بانا ہے

اسلام عدل اور اعتدال کا مکتب ہے اسکی راہ ، راہ مستقیم ہے اور اسکی امت ، امت اسلامی اور امت وسط ہے اس کا نظام عادلانہ نظام ہے، اگر اسمیں آنسوؤں کا سیلاب ہے تو شمشیر کی جھنکار بھی ہے اگر وہ انسان کے بدن کی سلامتی کیلئے منصوبہ پیش کرتا ہے تو اس کی روح و معنوی ترقی پر بھی توجہ رکھتا ہے ، اگر اس میں نماز ہے تو زکواۃ بھی ہے جہاں خدا کے اولیا سے دوستی و محبت ہے وہاں ان کے دشمنوں سے دوری اور بیزاری بھی ہے اگر علم کی حمایت کرتا ہے تو عمل کی بھی حمایت کرتا ہے جہاں خدا پر توکل و بھروسہ کا حکم دیتا ہے وہاں تلاش و کوشش کا حکم بھی دیتا ہے اگر مالکیت کو محترم سمجھتا ہے تو مالکیت سے نا جائز فائدہ اٹھانے اور عدم ضرر کا قانون بھی بیان کرتا ہے، جہاں بخشش کا حکم دیتا ہے وہاں حدود کے اجراء کیلئے قاطعیت کا فرمان بھی جاری کرتا ہے تا کہ فیصلہ کرتے وقت رحم تمہارے اندر پیدا نہ ہونے پائے۔

امامؑ کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص نمازوں کو بڑی توجہ کے ساتھ پڑھتا ہے امامؑ پوچھتے ہیں «کیف عقلہ» اس کی عقل اور اس کا طرز تفکر کیسا ہے ، یعنی اگر کوئی شخص ذاتی طور پر عبادت میں صاحب کمال ہے تو اس کے تفکر اور تعقل پر بھی توجہ کرنی چاہیے۔

سماجی انصاف کا رابطہ الٰہی مکتب فکر سے

ہمارے معاشرے میں بعض نعرے ایسے ہیں جو صرف زبانی ہیں اور جب تک وہ اصل سے بہرہ مند نہ ہوں اس وقت تک وہ نعرے کی حد سے خارج نہیں ہوتے ، سماجی انصاف بھی ایسے ہی نعروں میں سے ہے کہ تمام حکومتیں اس کا دم بھرتی ہیں اور خود کو اس کا طرفدار سمجھتی ہیں لیکن عملی طور پر آپ کسی بھی حکومت میں اس کا واضح اثر مشاہدہ نہیں کرینگے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ نعرے کسی اصل کے ساتھ متصل نہیں ہیں اسلام میں مساوات اور برابری کا سر چشمہ بعض عمیق اصول جو اس طرح ہیں ۔

۱ ۔ پوری کائنات خدائے حکیم کے زیر نظر ہے اور کسی قسم کا کوئی ہرج ومرج اور بے نظمی نہیں ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ میں بھی جو اس عالم ہستی کا ایک جزء ہوں ، اپنی مرضی کے مطابق ہر کام کو انجام دوں اور یہ خیال کروں کہ صرف میرا بیان ہو اور میرا ہی چرچا ہو ۔

۲ ۔ ہمارے تمام افکار ، کرداراور رفتار خداکے زیرنظر ہیں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہم سب اس کے عدل وانصاف کی عدالت میں پیش ہونگے ۔

۳ ۔ ہم سب خاک سے بنے ہیں اور آخرکار خاک میں مل جائیں گے اور خاک کے ذرات کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے تا کہ میرے اور کسی دوسرے کے درمیان کوئی فرق ہو ۔

۴ ۔ سب لوگ خدا کے بندے ہیں اور اُن سے دوستی کرنا رضائے خدا کا

باعث ہے اور بہترین لوگ وہی ہیں جو سب سے زیادہ خیرخواہ ہیں۔

۵ ۔ پوری دنیا اپنے پیدا کرنے والے کے برحق قانون اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز نہیں کرتی۔

۶ ۔ ہم سب کے ماں اور باپ ایک ہیں یہ تفسیر و تحقیق جو انسان اور جہاں کے متعلق ہے وہی الٰہی مکتب فکر ہے جو عدالت قبول کرنے کیلئے ہموارترین راہ ہے لیکن ماحول، دوست و احباب اور خواہشات ایسی چیزیں ہیں جو اس راہ کو ختم کردیتی ہیں۔

عدالت خواہی ایک فطری چیز ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اچھائیوں اور برائیوں کی پہچان کو فطری طور پر انسان کے اندر قرار دیا ہے: «فالھمھا فجورھاو تقواھا» (سورہ شمس)

ایک چھوٹے بچے کو نظر میں رکھیں جو ایک سیب آپکے حوالے کرتا ہے پانی پینے جاتا ہے اور پھر واپس آتا ہے، جونہی وہ دیکھتا ہے کہ آپ نے سیب تھوڑا سا کھا لیا ہے وہ ناراض ہو جاتا ہے مخصوص نگاہ کے ساتھ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے آپ کو امین سمجھا تھا اور یہ سیب امانت تھا آپ نے اس امانت کے ساتھ کیوں خیانت کی! یہ معنی بچے کے ذہن میں ہے چاہے وہ زبان پر لائے یا نہ لائے آپ نے ملاحظ فرمایا کہ خیانت کی برائی ایک ایسا مسئلہ ہے جو استاد اور مربی سے بے نیاز ہے انسان احساس کرتا اور فطرتاً اس کو بُرا سمجھتا ہے۔

عدالت بھی ان چیزوں میں سے ہے جن کو انسان فطرتاً دوست رکھتا ہے اور

اس کی دلیل یہ ہے کہ ظالم و ستمگر بھی اپنے ظلم و ستم کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اپنے کام کو عادلانہ طور پر دکھا سکے کبھی بعض افراد ایک دوسرے کی شرکت سے چوری کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن جب چوری شدہ اموال کو کسی دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں اور مال کی تقسیم کرنے کا وقت پہنچتا ہے تو وہ بھی آپس میں کہتے ہیں آئیے اموال کو عادلانہ طور پر تقسیم کریں! یہ بات کبھی بغیر سوچے سمجھے کہی جاتی ہے اور اگر زبان پہ نہ بھی لائیں تو بھی قلبی طور پر عادلانہ تقسیم کو دوست رکھتے ہیں اور اگر کوئی شریک کار زیادہ حصہ لینا چاہیے تو باقی افراد ناراض ہو جاتے ہیں۔

ہمیشہ ایسا رہا ہے کہ اگر کوئی شخص سماجی عدل کو برقرار کرنے کیلئے یا اپنی جان و مال، عقیدہ اور ملک سے دفاع کیلئے مارا جائے یا ستمگروں کے مقابلے میں قیام کرے، دنیا والے اسے اچھی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ عدل کی حمایت اور ظلم کے خلاف جہاد کرنا ہر انسان کی عقل و فطرت اور طبیعت کے عین مطابق ہے۔

عادلانہ اور منصفانہ قانون صرف مکتب انبیاء کے سائے میں ممکن ہے۔

شاید ایسے معاشرے بہت کم ہیں جو حق و قانون اور عدالت کی بات نہ کہتے ہوں، اور بہت کم ایسے ادارے ہیں جو خود کو معاشرے کے مصالح و انسانی حقوق کا حامی نہ جانتے ہوں ہم اس بارے میں تحقیق کرتے ہیں اور بعض سوالات کو بیان کرتے ہیں، منجملہ:

۱۔ کون سا قانون سو فیصد عادلانہ اور شخصی و گروہی ظلم و استبداد سے خالی ہوسکتا ہے ؟

۲۔ کون قانون بنانے والا ایسا ہے کہ اس کی ذاتی خواہشات اس قانون پر اثرانداز نہ ہوتی ہوں ؟

۳۔ کون سے معیار کے مطابق منصفانہ و عادلانہ قانون تشکیل دیے جاتے ہیں؟

۴۔ یہ قانون کون سے اجتماعی موقف کی بات کرتے ہیں اور کون سے گروہ اور طبقہ کے مصالح و مفادات کے وہ محافظ ہیں ؟

۵۔ بالفرض اگر قانون بنانے والے حزب ، قبیلے ، علاقے اور ذات کی وابستگی وغیرہ سے بالاتر رہے ہوں تو کہاں سے انھوں نے انسان کے تمام پہلوؤں پر توجہ دی ہو اور کیا معلوم کہ ان قوانین کے اثرات سے جلدی یا دیر سے لوگوں کے لئے ضرر و نقصان کا باعث نہ ہوں .

ہم انہیں سوالات کی وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سماجی انصاف عادلانہ قانون سے وابستہ ہے اور وہ اللہ اور مکتب انبیاءؑ کی راہ پر چلے بغیر ممکن نہیں ہے.

عدالت بنیادی شرط ہے

اسلام میں تمام حساس عہدے اور منصب عادل افراد کے دوش پر ہیں وہ لوگ جو عوام کے سامنے برا سابقہ نہ رکھتے ہوں ، صلاحیت اور پاکیزگی نفس کے لحاظ سے عوام کے درمیان مشہور ہوں عدالت میں جج اور قاضی سے لیکر گواہ اور عرض نویس سب کو چاہیے کہ وہ جس مقام پر بھی فائز ہیں عادلانہ طور پر بات کہیں اور

عادلانہ طور پر اس کو لکھیں نماز جمعہ و جماعت میں بھی امام کا عادل ہونا ضروری ہے۔

مرجع تقلید و رہبر انقلاب اور بیت المال نیز نکاح و طلاق کے مسائل تک، ان تمام موارد میں عدالت کا ہونا ضروری ہے، خبر کے سلسلے میں صرف عادل افراد کی خبر قابل اطمینان ہے مختصر یہ کہ اسلام نے عدالت کو ایک خاص اہمیت دی ہے اور اس کو معاشرے کے ہر حصے میں حقوقی، اجتماعی اور خاندانی و اقتصادی مسائل میں ایک بنیادی شرط کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

عدالت کی اہمیت اسلامی روایات میں

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ، عدل ساعة خیرٌ من عبادة سبعین سنة قیام لیلها و صیام نهارها » ۲ (جامع السادات / جلد ۲ صفحہ ۳۴۳) پیغمبرؐ اکرم نے فرمایا، عدالت کی ایک گھڑی ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے جس میں راتوں کو انسان بیدار رہا ہو اور دنوں میں اس نے روزے رکھے ہوں۔

« قال النبی صلی اللہ علیہ والہ، لعمل الامام العادل فی رعیته یوماً واحداً افضل من عبادة العابد فی اهله ماة عام او خمسین » ۳ / (نظام الاسلام الیاسی / صفحہ ۱۸۷ تحریر بقر شریف القرشی) ایسے رہبر کا ایک دن کا عمل جو لوگوں کے درمیان عدالت سے رفتار کرے اس شخص کے سو یا پچاس سال کے عمل سے بہتر ہے جو اپنے اہل و عیال کے درمیان عبادت میں مشغول رہا ہو۔

قال الصادق علیہ السلام: « الامام العادل لاترد له دعوة » عادل رہبر کی دعا ہرگز رد نہیں ہوتی ہے۔ قال الامام امیرالمومنین علیہ السلام، « فی العدل صلاح

البریہ والاقتداء بسنہ اللہ و قال ، « العدل حیوۃ والجور ممات » (نظام الاسلام السیاسی صفحہ ۱۱ ، قصار الجمل) حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ عدالت میں لوگوں کی مصلحت بھی ہے اور سنت خدا کی پیروی بھی ۔ اور آپؑ نے فرمایا عدالت حیات و زندگی ہے اور ظلم موت ہے جی ہاں، جو لوگ ظلم کے سامنے تسلیم ہوجاتے ہیں وہ در حقیقت مردہ ہیں۔

عدالت کی اہمیت

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر میں « یحی الارض بعد موتھا » فرمایا ۔ کہ زمیں عدالت کے قائم کرنے اور حدود الہی کے اجراء کے ذریعہ زندہ ہو جائیگی (قصار الجمل)۔

عدالت قائم کرنا انبیاءؑ کا ایک مقصد

قرآن نے انبیاء کیلئے کچھ ذمہ داریوں کو بیان فرمایا ہے کہ ان میں سے ایک اجتماعی عدالت کا قائم کرنا ہے اور ہم ایک فہرست ان معصومؑ ہستیوں کے کارناموں کی یہاں پیش کرتے ہیں :

۱ ۔ لوگوں کو خدا کی بندگی کی طرف دعوت دینا اور طاغوت سے دوری اور اس کی مخالفت پر آمادہ کرنا « ان اعبدوا اللہ وا جتنبوا الطاغوت » تمام انبیاء لوگوں کو یہ دعوت دیتے رہے خدا کی بندگی کرو اور طاغوت سے دوری اور اجتناب اختیار کرو (سورہ نحل / آیہ ۳۶)

۲۔ لوگوں کو ڈرانا اور خوشخبری دینا انا ارسلناک بالحق بشیراً ونذیراً، ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ لوگوں کو گناہ، فساد، اور عذاب آخرت سے ڈرائیں اور دوسری جانب خدا کے وعدوں کے متعلق لوگوں کو خوشخبر دیں۔ (سورہ بقرہ آیہ ۱۱۹)

۳۔ لوگوں کی تعلیم و تربیت «یزکیھم و یعلمھم» اس نے پیغمبرؐ کو لوگوں کیلئے بھیجا تاکہ وہ ان کی تربیت کرے اور ان کو تعلیم دے۔ (سورہ جمعہ / آیہ ۲)

۴۔ ہر قسم کی قید و بند کے خلاف جدوجہد اور فرسودہ اور بُری رسومات کی زنجیروں سے لوگوں کو آزاد کرنا ان کا مقصد رہا ہے «ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم» (سورہ اعراف / آیہ ۱۵۷) پیغمبرؐ ایسے سنگین بار اور زنجیریں جو لوگوں کے گلے میں پڑی ہوئی ہیں ان کو اٹھاتے ہیں اور لوگوں کو آزاد کرتے ہیں۔

۵۔ اپنے زمانے کے بناوٹی رہبروں کی انحرافی خطاؤں کو افشا کرنا اور انھیں ذلیل و رسوا کرنا (فرعونوں، قارونوں اور انکے عملی و فکری روش کو ظاہر کرنا) «ولتستبین سبیل المجرمین» (سورہ انعام / آیہ ۵۵)

۶۔ انبیاء کا چھٹا مقصد ایک ایسے ماحول و معاشرے کی تشکیل ہے کہ جس میں لوگ عدل و انصاف کے ساتھ زندگی بسر کریں اور تمام خاندانی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی روابط میں دوست اور دشمن کے ساتھ ایک عادلانہ رفتار سے پیش آئیں۔ انبیاء کا مقصد یہ ہے کہ خدا اور قیامت پر لوگوں کے اندر ایمان کو زندہ کریں، اور

الٰہی طرز تفکر اور اخلاق کو معاشرے کے ہر شعبے میں قائم کریں تا کہ خود لوگ عدالت کی طرف متوجہ ہوں اور عدل پر مشتمل معاشرہ کو تشکیل دیں۔ «ولقد ارسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط» (سورہ حدید / آیہ ۲۵) ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح دلائل اور آسمانی کتاب و میزان کے ساتھ لوگوں کی طرف بھیجا تا کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل قائم کریں اور کیونکہ ایک عادل معاشرے کے لئے معنوی قدرت کی بھی اور مادی قدرت کی بھی ضرورت ہوتی ہے لہذا مذکورہ آیت میں دونوں قدرتوں طاقتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے (بینات و کتاب و میزان) ہر ایک عدل قائم کرنے کیلئے ایک معنوی طاقت ہیں، و یہ جملہ (وانزلنا الحدید) جو آیت کے بعد میں ذکر ہوا ہے مادی قدرت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سرکش جان لیں کہ جب بھی وہ ضد اور ہٹ دھری کریں تو قدرت کے ساتھ سرکوب کئے جائیں گے۔

لہذا معلوم ہوا کہ سماجی انصاف کو قائم کرنا انبیاء کے مقاصد میں سے ایک مقصد رہا ہے۔

سماجی عدل و انصاف کے بعض نمونے

امامؑ کا استدلال مساوات کے بارے میں:

یہ اعتراض جو امیرالمؤمنینؑ پر کیا جاتا تھا کہ آپ اموال کو کیوں مساوی طور تقسیم کرتے ہیں اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں (خطبہ ۱۲۶ / نہج البلاغہ)۔

۱۔ اگر یہ اموال میری ذاتی ملکیت ہوتے تو بھی میں ان کو یکساں طور پر تقسیم

کرتا چہ جائیکہ یہ سب خدا کا مال ہے جو تمام لوگوں سے متعلق ہے لہذا اس مال میں سب لوگ حق رکھتے ہیں (لو کان المال لی لسویت بینھم فکیف وانما المال مال اللہ) .

۲ ۔ جو شخص مال کو غیر مناسب جگہ خرچ کرے تو اس نے مال میں اسراف و تبذیر کیا (الا وان اعطاء المال فی غیر حقه تبذیر واسراف) (قرآن نے بیہودہ خرچ کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے) (ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین) (سورہ اسراء)

۳ ۔ غیر مساوی تقسیم اس بات کا باعث بنتی ہے کہ دنیا پرست لوگوں کا ایک گروہ انسان کے ارد گرد چکر لگانے لگتا ہے جو تملق اور غیر ضروری مدح و تعریف کے ذریعہ کچھ اموال ہتھیانے کی کوشش کرتے ہیں . اور اس طرح وہ انسان کو بارگاہ عدل الٰہی کے سامنے سرنگوں کردینے کے درپے ہوتے ہیں «وھو یرفع صاحبه فی الدنیا و یضعه فی الاخرة و یکرمه فی الناس و یھینه عند اللہ » پھر امامؑ اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر انسان اپنے مال کو نا مناسب جگہ اور نا مناسب شخص کو دے تو خداوندعالم اس کو ان لوگوں کی مدح و تعریف سے بھی محروم کردیتا ہے جنہوں نے اس کے مال کو ناحق طور پر لیا ، اور جلد یا بدیر تاریخ کی ورق گردانی ہوتی ہے اور حالات بدل جاتے ہیں تو وہی تعریف کرنے والے لوگ اس انسان سے روگرداں ہوجاتے ہیں اور کسی دوسرے کی محبت کو دل میں بٹھا لیتے ہیں.

ایسا انسان جو مال کو نامناسب جگہ پر خرچ کرے نہ تو عدل الٰہی کے حضور میں آبرو مند رہتا ہے اور نہ ان دنیا پرست لوگوں کے سامنے ، جو اس کے ارد گرد جمع ہوئے اور اس کی ناانصافیوں اور بے عدالتیوں سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ابھی تو اس کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہیں اور اگر بدبختی کا دن اس پر آجائے تو یہ اس کو چھوڑ دینگے اور اُس کے بدترین ساتھیوں میں شمار ہونگے۔

امامؑ کے ارشاد کو ہم نے مختصر توضیح کے ساتھ بیان کیا اب اُس کے متن کو بھی ہم نقل کرتے ہیں (ولم یضع امر، ماله فی غیر حقه و لا عند غیر اهله الا حرمه الله شکرهم وکان لغیره ودهم فان ذلت به النعل یوما فاحتاج الی معونتهم فشر خلیل والام خدین) (نہج البلاغہ / صبحی صالح / خطبہ ۱۳۱ / صفحہ ۱۸۳)۔

وہ مقام جہاں عدالت اسلامی اموال کو ضبط کرتی ہے

جتنا وقت پیغمبرؐ اسلام کے زمانے سے گزرتا گیا لوگوں کا فاصلہ بھی اسلام کے سماجی عدل و انصاف سے زیادہ ہوتا گیا آہستہ آہستہ کام اس مرحلے تک پہنچ گیا کہ عثمان نے کچھ مال بے حساب اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے درمیان بانٹ دیا اور بہت سی اراضی اُن کے اختیار میں دے دی ، اس تبعیض اور نا انصافی نے لوگوں کو اُس سے ناراض کردیا یہاں تک کہ اس کو قتل کردیا گیا اور لوگوں نے حضرت علی علیہ اسلام کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

اب حضرت علیؑ کی حکومت آئی غلط رسمیں اٹھائی جانے لگیں نور دیدوں کے اموال کو ضبط اور عزل و نصب کے سلسلے میں مناسب کاروائی اور نئے سرے سے

اقدام کیا گیا یہ حضرت علیؑ کے انقلابی اور فوری پروگرام تھے اب ہم انھیں کے کلام کو یہاں نقل کرتے ہیں آپ نے فرمایا: (واللہ لو وجدته قد تزوج به النساء و ملک به الاماء لرددته) (خدا کی قسم وہ بے حساب مال اور زمینیں جو عثمان نے اپنے دائیں و بائیں بیٹھنے والوں کو (اپنے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں میں) بخشیں تھیں حتی اگر وہ مال کنیزوں کی خریداری اور عورتوں کے مہر میں بھی خرچ ہوا ہو پھر بھی میں اس کو بیت المال میں واپس کرونگا) (نہج البلاغہ / خطبہ ۱۵ / صفحہ ۵۷)

عرب اور عجم کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے ۔ دو عورتیں بیت المال سے اپنا حصہ لینے کیلئے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، انمیں سے ایک عورت عربی تھی اور دوسری عجمی ، امامؑ نے اپنی ہمیشہ کی روش اور عدالت کے مطابق دونوں عورتوں کو یکساں طور پر حصہ دیا۔

وہ لوگ جنھوں نے ابھی تک اسلامی ثقافت کو لمس نہیں کیا تھا اور اس کی عدالت کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے انھوں نے حضرت پر اعتراض کیا اور کہا، کیا آپ عرب اور عجم یکساں طور پر تقسیم کرتے ہیں ؟ امامؑ نے فرمایا، میں کوئی فرق نہیں سمجھتا ہوں (وسائل الشیعہ / جلد ۱۱ / صفحہ ۱۸) اکثر حضرت علی علیہ السلام لوگوں کے مختلف طبقوں کے درمیان جو مساوی روش اختیار کیے جانے پر خود خواہ اور طاغوت صفت لوگوں کی طرف سے اعتراضات کا نشانہ ہوتے تھے لیکن یہ اعتراضات ان کو ہرگز توحید اور عدالت کی حد سے خارج نہیں کرتے تھے اور قرآن کے مطابق وہ ان لوگوں میں سے تھے جن پر نا معقول ملامت کرنے والوں کی

ملامت کا اثر نہیں ہوتا تھا (و لا یخافون لومۃ لائم) (سورہ مائدہ آیہ ۵۴)

مُردوں کی اعداد شماری

جاہلیت کے زمانے کے افتخارات میں سے ایک قبیلے کی جمعیت کا زیادہ ہونا بھی تھا ،حتی قبیلے کے افراد کے سلسلے میں نزاع و لڑائی یہاں تک پہنچی ، کہ انھوں نے کہا کہ ہر قبیلے کے مُردوں کو بھی شمار کریں تاکہ یہ دیکھیں کہ کون سے قبیلے کی جمعیت بہت زیادہ ہے ! آیت نازل ہوئی کہ ۔ « الھکم التکاثر حتی زرتم المقابر » کثرت اور زیادتی کے ساتھ دلچسپی نے تمہیں سرگرم بنا دیا یہاں تک کہ مُردوں کے مقبروں کی طرف گئے اور اُن کو بھی شمار کیا اور تم نے اُن کے عدد پر افتخار کیا ۔

حضرت علیؑ نے خطبے ۲۲۱ میں اس آیت کو پڑھنے کے بعد اس قسم کے طرز تفکر کی مذمت کرتے ہیں ۔ایک مرتبہ ایک جلسے میں جہاں ہر شخص اپنے قبیلے و نسل اور حسب و نسب کے متعلق گفتگو کر رہا تھا اور فخر کا اظہار کر رہا تھا وہاں حضرت سلمان فارسی کی باری آئی ۔ جلسے کے تمام لوگ سوچ رہے تھے کہ وہ چونکہ کسی جانے پہچانے قبیلے سے نہیں ہیں لہذا شرم کریں گے ، لیکن سلمان جو اسلام کی ثقافت کے پروردہ تھے انھوں نے عظیم سرافرازی و سر بلندی کے ساتھ فرمایا میرے رشتہ داروں سے کوئی سرو کار نہ رکھنے میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں گمراہ تھا اور حضرت محمدؐ کے ذریعہ میری ہدایت ہوئی ہے اور جو چیز میرے نزدیک اہم ہے وہ یہی ہے اور بس (سفینۃ البحار جلد ۴ صفحہ ۳۳۸) انھوں نے اپنے اس ٹھوس جواب کے ساتھ اُن کے جھوٹے فخر فروشی اور مکر و فریب کو بے اثر بنادیا ، اور تمام امتیازات کو ختم

کردیا اور اسلام و خداوندعالم کے نزدیک سب کیلئے مساوات کے مسئلے کو بیان کردیا۔

لوگوں کو خریدنے کا امامؑ کو مشورہ

ایک مصلحت پسند گروہ حضرت علیؑ کی خدمت میں پہنچا اور کہا (افضل الاشراف من العرب و قریش علی الموالی والعجم و من تخاف علیہ من الناس و فراہ الی معاویہ) آپ عرب اور قریش کے جانے پہچانے افراد کو زیادہ حصہ ہما اس طرح ان کو اپنے ارد گرد جمع کریں کیونکہ اگر آپ ان کے حصے کو غلاموں اور عجمیوں کے حصہ سے زیادہ نہ دیں تو ممکن ہے یا تو وہ کارشکنی کریں یا معاویہ سے جا ملیں۔ امامؑ نے فرمایا کیا لوگوں کو جذب کرنے کیلئے میں بیت المال صرف کروں؟ کیا باج دوں؟ یقیناً جو شخص پیسہ لیکر ہمارا طرفدار ہو وہ دوسری طرف سے زیادہ پیسہ لیکر ہمارا مخالف بھی ہو سکتا ہے ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام اور عدالت کا تحفظ کریں اور لوگوں کو خوف اور لالچ کے ذریعہ جذب کرنے پر توجہ نہ رکھیں، میں ہرگز کسی شخص کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا جو چاہتا ہے ہمارے ساتھ رہے اور جو جانا چاہتا ہے چلا جائے جی ہاں یہ ہے امامؑ کی روش کہ ایک گروہ کو جذب کرنے کیلئے حاضر نہیں ہیں عدالت کے خلاف عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ (بحار ج ۴۱ طبع قدیم صفحہ ۱۰۸)

اخوت کا ایک نمونہ

شہر بلخ کا رہنے والا ایک شخص کہتا ہے: کہ میں امام رضاؑ کی خدمت میں

حاضر تھا، کھانے کا وقت ہوا، اور ایک دسترخوان لایا گیا امامؑ نے تمام سیاہ اور سفید غلاموں کو دستر خوان پر بلایا، اور خود بھی ان کے پاس بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بیٹھ گئے، امام کو مشورہ دیا گیا کہ غلاموں کیلئے ایک الگ دسترخوان بچھا دیا جائے! امامؑ نے فرمایا، ہمارا خدا ایک ہے اور ہم سب ایک باپ اور ایک ماں سے ہیں اور اچھائی اور برائی کا بدلہ قیامت سے متعلق ہے لہذا یہ خود خواہی کس لیے؟ (کافی جلد ۸، صفحہ ۲۳۰) اگر ایک دن ہم یہ دیکھیں کہ ہر شخص ہر کس مرتبہ کے باوجود تمام لوگوں کے ہمراہ بغیر کسی رنج و تکبر کے اٹھتا بیٹھتا ہے گویا اس دن ہمارا ثقافتی انقلاب کھل اٹھے گا اگر ہر مسلمان بغیر کسی احساس برتری اور امتیاز کے ایسا کرے، وہ لوگوں کے ساتھ ہو، اور لوگوں میں سے ہو، لوگوں میں رہے اور اسلامی اخلاقیات کو اپنے اندر زندہ کرے، تو ہر وہ انسان جو ہمارے ساتھ نشست و برخاست رکھے گا، وہ ہم سے اور ہمارے مکتب سے آملے گا.

اسلام میں مساوات

صدیاں گذر چکی ہیں کہ دنیا میں سیاہ فام لوگوں پر ظلم و ستم ہوتا رہا ہے، اُن کے حمام، ہوٹل، پارک اور اُن کے ہسپتال اور مدرسے و قبرستان سفید فام لوگوں سے الگ ہیں. اسلام نے صراحت کے ساتھ ان تمام امتیازات کو ختم کیا اور فرمایا. (ان اکرمکم عند اللہ اتقیکم) خدا کے نزدیک پسندیدہ تر وہ لوگ ہیں جو پرہیز گار ہیں (سورہ حجرات) شکلوں، قوموں اور زبانوں کا فرق خدا کی قدرت کی نشانیاں ہیں (ومن آیاتہ اختلاف السنتکم و الوانکم) (سورہ روم / آیہ ۲۲) پیغمبر اسلامؐ نے حج

کے آخری سفر میں لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تمام مسلمان جس قبیلے و قوم اور زبان سے تعلق رکھتے ہوں برابر ہیں (سفینۃ البحار، جلد ۲، صفحہ ۳۴۸) پیغمبرؐ اسلام اپنے زمانے میں بعض عہدے غلاموں کو دیتے تھے، سفید اور سیاہ کے درمیان رشتہ ازدواج برقرار کرتے تھے، حتی اپنی پھوپھی کی لڑکی کو ایک سیاہ فام غلام سے بیاہ دیا اس طرح برتری کے مسئلے کو ختم کردیا۔

ایک غلط روش پر اعتراض

(ثم افیضو من حیث افاض الناس) (سورہ بقرہ/ آیہ ۱۹۸) پروردگار عالم نے اس آیت میں ایک ایسے امتیاز پر جسے قریش اپنے لئے قابل فخر سمجھتے تھے خط بطلان کھینچ دیا ہے اس برتری اور فخر کی دلیل یہ تھی کہ وہ لوگ خانۂ کعبہ کے سرپرست تھے، اسی وجہ سے وہ حج کے مراسم میں صحرائے عرفات کی طرف نہیں جاتے تھے اس کے بجائے (مزدلفہ) کی طرف جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم حرم خدا والے ہیں اور ہم حرم سے الگ نہیں ہو سکتے آیت نازل ہوئی کہ تم بھی اسی طرف جاؤ جہاں دوسرے لوگ جاتے ہیں اور اظہار فخر کو چھوڑ دو۔

مکتب فکر اور دکان رکھنے میں

مستکبرین حضرت نوحؑ کے ماننے والوں کی توہین کرتے اور ان کو رذیل اور پست لوگوں میں شمار کرتے تھے ان کو مشورہ دیتے کہ اگر آپ ان لوگوں کو اپنے سے دور کریں تو ہم آپ کے پاس بیٹھ سکتے ہیں؛ وہ حضرتؑ نے جو ہمیشہ غریبوں

اور مستضعفین کے حامی تھے اس کا منفی جواب دیا اور فرمایا وما انا بطارد الذین آمنوا میں ہرگز با ایمان لوگوں کو (مستکبرین کو جذب کرنے کی خاطر) اپنے سے دور نہیں کرونگا (سورہ ہود/ آیہ ۲۹) وہ چیز جو ہمارے لیئے باعث اہمیت ہے وہ وہی سماجی عدل و انصاف اور مکتب عقیدہ کی حفاظت ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم لوگوں کو اس کے سائے میں جذب کریں نہ یہ کہ عقیدہ کے ایک حصہ کو نظر انداز کردیں اور اس کے ایک حصہ کو چھوڑدیں اور حق و عدالت کے محور سے خارج ہو جائیں شاید بعض لوگ ہم سے ملحق ہو جائیں اس قسم کی فکر صرف دکانداری اور مُرید بازی ہے نہ کہ اور خدا پرستی.

ایک روٹی کی عادلانہ تقسیم

کچھ لوگوں نے کچھ عمومی اموال کو حضرت علیؑ کی خدمت میں پیش کیا اور لوگ اس کو لینے کیلئے ٹوٹ پڑے امامؑ نے مال کے ارد گرد ایک رسی کھینچ دی تا کہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے اور لوگوں سے کہا کہ اس سے ذرا فاصلہ اختیار کریں اور آگے نہ آئیں پھر امامؑ خود داخل ہوئے اور پورے مال کو قبائل کے نمائندوں کے درمیان تقسیم کردیا آخر کار امامؑ کی نظر ایک روٹی پر پڑی جو ایک برتن میں باقی رہ گئی تھی، امامؑ نے حکم دیا کہ اس روٹی کو بھی تمام بیت المال کی طرح سات حصوں میں تقسیم کریں اور ہر قبیلے کو اس کا ایک حصہ دے دیں. (بحار، جلد ۴۱، صفحہ ۱۳۶)

ہمارا انقلاب اسی وقت دوسرے ممالک میں پھلے پھولے گا جب اس روش کو خود ہم اپنے ملک میں رائج کریں اور دنیا کو بھی باور کرائیں اور سمجھائیں اور

اسراف و تبذیر کے بجائے یہ وقت نظر بیت المال میں بھی رکھیں اور حاکم اسلامی اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک موازنہ کریں۔

کچھ لوگوں کیلئے اعتقاد خراب نہ کریں

مدینے کے ایک مسلمان کے گھر سے کچھ چیزیں چوری ہوگئیں اس سلسلے میں دو آدمیوں پر الزام عائد ہوا، چوروں میں سے ایک مسلمان اور دوسرا یہودی تھا دونوں کو گرفتار کر کے پیغمبر اکرمؐ کے سامنے پیش کیا گیا، مسلمانوں کے درمیان بے چینی پیدا ہو گئی کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مسلمان نے چوری کی ہے تو ہماری آبرو مدینہ میں اور یہودیوں کے نزدیک باقی نہیں رہے گی، پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں پہنچے اور کہا، مسلمانوں کی عزت خطرے میں ہے یہ کوشش کریں کہ مسلمان بری ہو جائے ؛ لیکن پیغمبر اکرمؐ غلط اور نا حق فیصلے کو اسلام اور مکتب اسلام کیلئے آبروریزی سمجھتے تھے، انھوں نے کہا یہودیوں نے اب تک ہم پر مظالم ڈھائے ہیں اور بالفرض اگر اس سلسلے میں ایک یہودی پر ظلم ہو بھی جائے تو یہودیوں کے ان مظالم کے سامنے یہ ایک معمولی سی چیز ہے ؛ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا، عدالت اور قضاوت کا حساب گذشتہ تلخیوں کے حساب سے الگ ہے۔ آخر کار دونوں ملزموں کے متعلق پیغمبرؐ نے چھان بین فرمائی اور مسلمانوں کی مرضی کے برخلاف یہودی بری ہوگیا، عدالت کا یہ نمونہ اگر چہ اس زمانے کے مسلمانوں کیلئے سطحی طور پر آبروریزی کا باعث تھا لیکن حقیقت میں اس نے عدالت اور مکتب اسلام کو ہمیشہ کیلئے آبرومند اور باعظمت بنا دیا، ہاں ہمیں اپنے مکتب اور عقیدہ کی فکر کرنی

چاہئے اور لوگوں اور گروہوں کو خوش رکھنے کیلئے نہ تو مکتب سے کسی چیز کو کم کرنا چاہیے اور نہ اس میں کسی چیز کا اضافہ کرنا چاہیے۔

ایک نامناسب توقع کا جواب

ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ کی بزم کے پاس سے گزرا انھوں نے کم سرمایہ اور غریب لوگ مثل عمار یاسر اور بلال کو پیغمبرؐ کے پاس بیٹھے دیکھا اور بڑے تعجب کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ سے کہا۔ کیا آپ نے انہی گمنام لوگوں پر قناعت کی ہے، جتنا جلدی ہو سکے انکو اپنے پاس سے دور کریں تا کہ ہمارے۔ جھکاؤ کا راستہ پیدا ہو جائے

صاحب تفسیر المنار اس واقع کو نقل کرنے کے بعد یوں اضافہ کرتے ہیں کہ عمر نے قریش کے مستکبرین کے اس مشورے کی طرف دلچسپی کا اظہار کیا اور پیغمبرؐ سے کہا کہ بطور امتحان کچھ عرصے کیلئے ان غریب لوگوں کو اپنے سے دور کیجئے۔ تا کہ ہم دیکھیں کہ ان مستکبرین کے۔ جھکاؤ کیلئے کوئی راہ ہموار ہوتی ہے یا نہیں ؟ اور کیا وہ اپنے مشورے میں سچے ہیں؟ آیت نازل ہوئی اور پیغمبر اکرمؐ کو آگاہ کیا کہ

«ولاتطرد الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ» (سورہ انعام آیہ ۵۲)

وہ لوگ جو صبح و شام خدا کو یاد کرتے ہیں اور اس کی ذات پاک کے سوا کسی کو نظر میں نہیں رکھتے ان کو اپنے سے دور مت کرو پھر آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے اگر ان مؤمنین کو اپنے سے دور کروگے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے

فیصلوں کو سطحی طور پر نہ لیں

دو بچوں نے قسم کی تحریر لکھی اور اسکو امام حسنؑ کے پاس لے آئے تاکہ وہ ان دونوں کی تحریر کے درمیان فیصلہ کریں ہر معمولی انسان یہاں اس مسئلے کو سطحی نظر سے دیکھتا ہے، کیونکہ اول یہ کہ فیصلہ تحریر کے سلسلہ کرنا ہے دوسرے اس مسئلے کے طرفین دو بچے ہیں۔ لیکن تھوڑا ہو یا زیادہ، بچہ ہو یا بڑا ہو جو کچھ ہے وہ قضاوت ہے۔ لہذا حضرت علیؑ نے امام حسنؑ کو آگاہ کیا کہ قضاوت کرتے وقت متوجہ رہو، جو کچھ قضاوت تم آج کرو گے کل قیامت کے دن خدا کی عدالت میں اس کا جواب دینا ہے ؛ ((انظر کیف تحکم فان هذا حکم و الله سائلک عنه یوم القیامه)) (مجمع البیان، جلد ۱۰ صفحہ ۹۳)۔

جب مہمان کو بھی باہر کرتے ہیں

ایک شخص حضرت علیؑ کے ہاں مہمان ہوا۔ ایک مدت کے بعد اُس کے اور اُس کے حریف کے مقابل جو جھگڑا ہوا تھا حضرت علیؑ کے سامنے پیش ہوا، امامؑ نے فرمایا۔ تو اب تک مہمان تھا لیکن اب کہ تم جھگڑے کے ایک حریف ہو لہذا ہمارے ہاں سے باہر چلے جاؤ، کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے ؛ کہ ہرگز مدعی اور مدعاعلیہ میں سے کسی کو مہمان نہ بنائیں مگر یہ کہ دوسرا شخص بھی حاضر ہو مہمانی کا حساب الگ ہے اور فیصلہ کرنے کا حساب الگ، مہمانی مہربانی کی بنیاد پہ ہوتی ہے اور فیصلہ قانون کی بنیاد پہ اصولی طور پہ ہر قسم کے اور روحی کام سے جن

کا کچھ فیصد عدالت اور قضاوت پر اثر ہونے کا احتمال ہو دوری اختیار کرنی چاہئے (وسائل رجلد ۱۸، صفحہ ۱۵۷) حضرت علیؑ مالیات جمع کرنے والے افراد سے سفارش کرتے ہیں کہ جس علاقے میں بھی تم جاؤ کسی کے گھر میں داخل نہ ہونا پانی کے چشمے کے پاس ٹھہر جاؤ، کیونکہ تمہارا مہمان ہونا ممکن ہے لوگوں سے مالیات وصول کرنے پر اثر انداز ہو ۱۳۱/ (نہج البلاغہ/ نامہ ۲۵)

قرآن مجید کا سخت اعتراض

قرآن کی آیات نازل ہو رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کر رہا تھا خود پیغمبر اسلامؐ اور بعض مسلمان بھی ہمیشہ اسلام کی پہچان اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے میں سعی و کوشش کرتے تھے اسی اثناء میں ایک جلسہ تشکیل پایا اور جانے پہچانے لوگوں نے اس میں شرکت کی، ان لوگوں کی گفتگو اور اسلام قبول کرنے کیلئے دعوت کے دوران ایک نابینا شخص داخل ہوا اور اس نے بولنا شروع کردیا اپنی کہی گئی باتوں کی وہ تکرار بھی کرتا تھا، اس نابینا شخص کے اس عمل نے گفتگو کا سلسلہ روک دیا لہذا جلسے کا مقرر ناراض ہو گیا اور اس کی پیشانی پر برہمی کے آثار نمایاں ہوگئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس حال میں نابینا شخص داخل ہو اور اگر داخل ہو گیا ہے تو کم از کم خاموش بیٹھا رہے جب کہ برہمی و خوشروی نابینا کیلئے کوئی فرق نہیں رکھتی۔

لیکن قرآن اس سلسلے میں "سورۃ عبس" کی چند آیات میں اشارہ کرتا ہے اور جلسے کے مقرر کو آگاہ کرتا ہے کہ تونے اپنا منہ کیوں بنا لیا اور ارشاد ہوتا ہے

کہ تو کیا جانتا ہے شاید وہ نابینا شخص ان تمام بڑے لوگوں سے حق اور تزکیہ کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو۔

حضرت علیؑ کی عدالت کا ایک دوسرا نمونہ :-

حضرت علیؑ کے بھائی عقیل بھوکے اور پژمردہ بچوں کے ساتھ اپنے بھائی امیرالمؤمنین کی خدمت میں پہنچے اور بیت المال سے زیادہ حصہ لینے کا تقاضہ کیا۔ ظاہری بات ہے کہ ہر بھائی اپنے بھائی کے بھوکے بچوں کو دیکھ کر متاثر ہوجاتا ہے۔ لیکن امامؑ نے صاف طور پر منفی جواب دیا۔ اور اپنے منفی جواب کے فلسفہ کو بھائی کے سامنے پیش کرنے کیلئے ایک گرم لوہے کو حضرت عقیل کی طرف بڑھایا اور فرمایا کہ جسطرح تم اس گرم لوہے کے قریب ہونے سے ڈرتے ہو اسی طرح میں بھی قیامت کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (نہج البلاغہ / صبحی صالح / صفحہ ۴۴۷)

جو کام کوئی شخص نہیں کرتا :-

معمولاً بڑے اور مشہور لوگ اشیاء کی خریداری کیلئے یا خود بازار جاتے ہیں یا اگر کسی اور کو بھیجیں تو وہ بیچنے والے کو بتا دیتا ہے کہ ہم اس چیز کو فلاں شخصیت کیلئے چاہتے ہیں تاکہ چیز بھی بہترین دے اور سستی بھی حساب کرے ؛ بعض مواقع پر یہ عمل ممکن ہے رشوت یا غلط طور پر فائدہ اٹھانے کا موجب بن جائے اور مسلمانوں کے بازار میں تبعیض پیدا ہو جائے کہ بہترین چیز کو ایک گروہ مناسب قیمت کے ساتھ خریدے اور دوسرے لوگ متوسط اور درمیانی اشیاء کو

زیادہ قیمت کے ساتھ خریدیں۔

لیکن صرف حضرت علیؑ تھے جو کوشش کرتے تھے کہ ایسے لوگوں سے چیز خریدیں جو انھیں نہ پہچانتے ہوں یا اگر کسی کو بازار بھیجتے تھے تو بیچنے والا متوجہ نہ ہو کہ وہ شخص کس کیلئے خریداری کر رہا ہے۔

امامؑ کی دقت نظر کا دوسرا نمونہ

حضرت علیؑ بیت المال کو بانٹتے تھے، امامؑ کے پوتوں میں سے ایک بچہ آیا اور ایک چیز اٹھا کر لے گیا، یہاں ہر باپ ممکن ہے مسئلہ کو نظر انداز کردے، لیکن امامؑ پریشان و سراسیمہ بچے کے پیچھے گئے اس چیز کو بچے کے ہاتھ سے لیا اور واپس بیت المال میں رکھ دیا۔

لوگوں نے حضرت سے کہا کہ اس بچے کا بھی حصّہ ہے۔ امامؑ نے فرمایا: "ہرگز نہیں؛ بلکہ صرف اسکے باپ کا حصّہ ہے، اور وہ بھی ہر عام مسلمان کے حصّے کے برابر، جب بھی اپنا حصّہ لے گا جتنا ضرورت سمجھے گا اس بچے کو دے دیگا" (حیاۃ الامام حسنؑ۔ باقر شریف القرشی جلد ۱ صفحہ ۳۸۸)

البتہ امامؑ کی اس قسم کی سختی صرف بیت المال سے متعلق تھی لیکن اپنا ذاتی مال بخشنے میں امام کی سخاوت اس درجہ پر ہے کہ معاویہ کہتا ہے کہ اگر حضرت علیؑ کے پاس دو کمرے ہوں ایک گھاس سے بھرا ہوا ہو اور دوسرا سونے سے تو ان کے لئے دونوں کا بخشنا یکساں اور مساوی ہے۔

حضرت علیؑ پر غیر مناسب اعتراض

طلحہ و زبیر پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب سے تھے اور اپنے لئے بعض امتیازات کے قائل تھے لہذا کبھی کبھار بیت المال کی تقسیم میں یا دوسرے مسائل میں حضرت علیؑ کی روش پر اعتراض کرتے تھے ایک مرتبہ امامؑ پر انھوں نے اعتراض کیا کہ آپ ہم سے مشورہ کیوں نہیں کرتے ہیں ؟!

امامؑ نے کام کی تفصیل اور اپنی عدالت و لیاقت و صلاحیت بیان کرنے کے بعد فرمایا " کیا آپ تصور کرتے ہیں کہ میں انحصار طلب اور ریاست خواہ ہوں اس وجہ سے آپ کے ساتھ مشورہ نہیں کرتا ؟

خدا کی قسم مجھے مقام ومنصب کی کوئی ضرورت نہیں تم نے خود مجھے مجبور کیا اور میری بیعت کی اور حکومت کی باگ ڈور کو میرے ہاتھ میں دے دیا ، میں نے بھی قرآن اور پیغمبرؐ کی روش کو سرمشق قرار دیا ہے اور ان کے دستورات کے مطابق عمل کرتا ہوں ابھی تک میں ایسے مسئلہ سے دوچار نہیں ہوا کہ اس کے متعلق کوئی حکم نہ آیا ہو اور اس میں تم سے یا تمام مسلمانوں سے مشورے کی ضرورت پڑی ہو .

اگر ضرورت پڑی تو تم سے بھی اور دوسروں سے بھی ضرور مشورہ کیا جائیگا اور کوئی فرق تمہارے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان مشورے کے سلسلے میں کوئی بھی نہیں رکھوں گا . (نہج البلاغہ / صبحی صالح / نامہ ۲۷ / صفحہ ۳۸۳)

عدالت رفتار میں

حضرت علیؑ نے "محمد بن ابی بکر" کو جو مصر میں امامؑ کے نمائندہ تھے، ان کے ایک نامہ میں یوں لکھا " وآس بینهم فی اللحظة والنظرة " (نہج البلاغہ / صبحی صالح / نامہ ۲۷ / صفحہ ۳۸۳) اپنے تمام اعمال اور رفتار میں مساوات کی رعایت کرو، یہ وقت اور عدالت اس لئے ہے کہ معاشرے کے کمزور لوگ تمہارے لطف سے مایوس نہ ہوں اور مستکبرین تمہاری بے عدالتی اور ظلم کی طمع و حرص نہ رکھیں۔ ایک حدیث میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ جس وقت لوگوں کے ساتھ بات کرتے تھے اپنی نگاہوں کو اصحاب کے درمیان عادلانہ طور پر تقسیم کرتے تھے (وسائل الشیعہ جلد ۸ / صفحہ ۴۹۹) اسلام نے اس قدر اس بارے میں توجہ دی ہے اور سفارش کی ہے کہ مہمان نوازی میں غذا (کھانا کھانے سے) صرف کرنے سے پہلے مہمانوں کا ہاتھ دھونے کیلئے اگر دائیں طرف سے آغاز کیا ہے تو کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کیلئے جب پانی لائیں تو بائیں طرف سے شروع کریں تاکہ وہ شخص جس نے سب سے پہلے ہاتھ دھوئے ہیں کھانے کے بعد سب سے بعد میں اپنے ہاتھ دھوئے۔ سچ بتائیں کہ آپ عدالت اور وقت کا یہ نمونہ کسی اور دین میں ہیں۔

کاغذ بازی نہ کریں

حضرت علیؑ نے ایک حکم نامہ میں اپنے نمائندوں کو لکھا " ادقوا اقلامکم " اپنے قلموں کی نوک کو تیز کریں " و قاربوا بین سطورکم " اور لکھنے میں

سطور کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ چھوڑیں " واحذفوا من فضولکم " اضافی باتوں کو چھوڑ دیں " واقصدوا قصد المعانی" عبارت پر زیادہ توجہ کے بجائے معانی و مطالب کے بیان پر اکتفاء کریں " وایاکم والاکثار" زیادہ لکھنے اور کاغذوں کو فضول خرچ کرنے سے پرہیز کریں " فان اموال المسلمین لاتحتمل الاضرار" کیونکہ یہ کاغذ بیت المال سے ہیں اور مسلمانوں کا بیت المال نقصان برداشت نہیں کرسکتا (بحار / جلد ۴۱ / صفحہ ۱۰۵) حضرت علی علیہ السلام خطبہ ۲۲۴ میں عدالت کی اہمیت اور ظلم سے نجات کے متعلق ایک بہترین بات ارشاد فرماتے ہیں اور اسی خطبے میں فرماتے ہیں " خدا کی قسم اگر سات اقلیم (جس طرح آج کرۂ زمین کو کچھ براعظموں میں تقسیم کیا گیا ہے گذشتہ زمانے میں کرۂ زمین کے رہائشی مناطق کو ہفت اقلیم سے تعبیر کیا جاتا تھا) کو بھی مجھے دیں تا کہ میں خدا کی معصیت کروں اور ایک چیونٹی کے منہ سے جو کا چھلکا لے لوں تو اس کے لئے تیار نہیں ہوں ، خدا کی قسم اگر صبح سے لیکر شام تک مجھے تیز چھریوں پر لٹائیں یہ میرے لئے اچھا ہے اس سے کہ میں خدا اور اسکے رسول گرامیؐ کے سامنے ستمکاروں میں شمار کیا جاوں۔

اپنا حصہ بڑھانے کی کوشش

طلحہ اور زبیر حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا عمر ہم کو دوسروں سے زیادہ حصہ دیتے تھے اور اس جملے کے ذریعہ انھوں نے اشارہ کیا کہ آپ بھی ہمیں زیادہ حصہ دیں ، حضرت علیؑ نے فرمایا " پیغمبر اکرمؐ آپ کو کیا دیتے تھے " ؟ وہ خاموش ہو گئے حضرتؑ نے فرمایا " کیا پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کے درمیان مال

مساوی طور پر تقسیم نہیں کرتے تھے" ؟ انھوں نے کہا ہاں پیغمبرؐ مساوی طور پر تقسیم کرتے تھے ۔ امامؑ نے فرمایا " میں پیغمبرؐ کی روش اختیار کروں یا عمر کی روش کو" ؟ انھوں نے کہا یقیناً پیغمبرؐ کی روش کو ۔ پھر امامؑ نے فرمایا " پس آپ بیشتر حصے کے کیوں منتظر ہیں" ؟ انھوں نے کہا اسلئے کہ ہم بھی اسلام لانے میں سبقت رکھتے ہیں ، پیغمبرؐ سے قرابت بھی رکھتے ہیں اور بہت نزدیک بھی ہیں ، تلخیوں و مشکلات میں بھی ہم نے زیادہ شرکت کی ہے ۔

امامؑ نے فرمایا " میں ان تینوں موضوعات میں تم پر سبقت رکھتا ہوں اور تم سے آگے ہوں ، کیوں کہ تم سے پہلے پیغمبرؐ پر ایمان لایا ہوں اور ان کے چچا کا فرزند اور ان کا داماد ہوں اور سب سے زیادہ میں نے لڑائیوں میں شرکت کی ہے لیکن خدا کی قسم ان تمام امتیازات کے باوجود میرا حصہ جبکہ میں اسلامی حکومت کا سربراہ بھی ہوں اس کارگر کے حصے کے برابر ہے جو اس گوشے میں کام کرتا ہے ۔

(بحار ، جلد ۴۱ ، صفحہ ۱۱۶)

عہدہ سے غلط فائدہ اٹھانا ممنوع

حضرت علیؑ نے اپنی حکومت کے پائیتخت کوفہ میں لوگوں سے خطاب فرمایا اور کہا " اے کوفہ کے لوگو ! اگر تم دیکھو کہ میں تمہارے شہر سے باہر گیا ہوں اور اس حالت کے بجائے جو پہلے تھی میرا لباس ، خوراک ، یا میرا غلام اور مرکب بدل گئے اور اپنی حکومت کے دوران میں نے ایک خوشحال زندگی اپنے لئے درست کرلی ہے تو سمجھ لو کہ میں نے حکومت میں تم سے خیانت کی ہے ۔ جب وہ لوگوں کو روٹی

اور گوشت دیتے تھے تو خود وہ روٹی کو بغیر گوشت کے استعمال کرتے تھے " کان علی یقول یا اھل الکوفہ اذا انا خرجت من عندکم بغیر راحلتی ورحلی و غلامی فلان فانا خائن ...." (بحار، جلد ۴۱، صفحہ ۱۳۷)

اسلام میں برابری کا ایک اور نمونہ

پیغمبرؐ لوگوں کے درمیان معمولی لباس کے ساتھ آیا جایا کرتے تھے اس طرح کہ کبھی اگر کوئی اجنبی شخص مسجد میں داخل ہوتا تو ان کو نہیں پہچان سکتا تھا تھوڑی دیر تک وہ لوگوں کے چہروں کو دیکھتا تھا اور آخر کار پوچھتا تھا " ایکم رسول اللہ " تم میں سے کون پیغمبرؐ ہیں اور اصحاب کے ساتھ بیٹھتے وقت دائرہ بنا کر بیٹھتے تھے .اس طرح کہ جلسے میں اونچی اور نیچی طرف کا تصور نہیں ہوتا تھا. ہاں یہ ہمرنگی و سادگی اور خصوصیات ، مکتب انبیاء کی دین ہے کسی ملک کا سفیر اسلامی انقلاب کے رہبر امام خمینیؒ کے گھر آیا اور اسنے کہا ان کے گھر میں بچھے معمولی فرش ان موکٹوں اوران کی سادہ زندگی نے مجھے حیران کردیا ہے .

عزیز داری ممنوع

ایک عورت جو ایک مشہور طائفہ بنی مخزوم سے تعلق رکھتی تھی . اس نے چوری کی . پیغمبرؐ نے ارادہ کیا کہ حکم خدا کو اس کے متعلق جاری کریں عورت کے خاندان والوں نے جو اس عمل کو اپنی توہین اور ذلت سمجھتے تھے دوڑ دھوپ شروع کردی اور ایک شخص بنام " اسامہ " کو جو پیغمبراسلامؐ کے دوستوں میں سے

تھے پیغمبرؐ کے نزدیک سفارش کا وسیلہ بنا کر بھیجا تا کہ چوری کہ حد اس عورت پر جاری نہ کریں۔

پیغمبر اسلامؐ غیض میں آگئے اور اسامہ سے فرمایا کیا تو وسیلہ بنتا ہے کہ حکم خدا جاری نہ ہو؟! گذشتہ امتوں کی ہلاکت اور بدبختی کی علت یہ تھی کہ جب بھی بڑے لوگ غلط کام کرتے تھے، حکم خدا انکے متعلق جاری نہیں ہوتا تھا لیکن کمزور اور گمنام لوگوں کی پر حد جاری ہوتی تھی خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دوں۔ (صحیح بخاری و مسلم بہ نقل از روح الدین اسلامی)

حکومت اسلامی میں
حکومت چلانے والے بھی کوڑے کھاتے ہیں

اس بات کے پیش نظر کہ اسلامی معاشرے میں عمومی عفت کا لحاظ رکھا جائے اور اسلام پردے کے حکم، نہی عن المنکر و امر بالمعروف کے علاوہ کچھ جگہوں میں بعض افراد (لوگوں) کے متعلق جسمی تنبیہ کو بھی جائز سمجھتا ہے۔ البتہ یہ جسمی تنبیہ لوگوں کی آبرو ختم ہو جانے کے برابر ہے لیکن اگر بعض لوگ خود چاہیں کہ عمومی عفت کو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے داغدار بنائیں اسلام کے قوانین و مذہب کو خاطر میں نہ لائیں اور اپنے غلط عمل کے ذریعہ دوسروں کیلئے بھی راہ ہموار کریں تو یہ وہ جگہ ہے جہاں سختی کے ساتھ اور شدت کے ذریعہ ان گستاخ لوگوں کو عوام کے سامنے تنبیہ کرنا چاہیے یہ تادیب خود ایک قسم کی عبادت ہے جو خدا کے حکم

کے مطابق جاری ہونی چاہیے اور انتقام لینے کا پہلو اس میں ہرگز نہیں ہونا چاہیے لہذا ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک عورت جو بدکاری کی مرتکب ہوگئی تھی . حضرت علیؑ کی عدالت میں بلائی گئی امامؑ نے مکمل تحقیق کے بعد حکم دیا کہ حکم خدا کو جاری کیا جائے . قنبر جو حضرت علیؑ کے چاہنے والوں میں تھے اور اس حکم کے اجراء کی ذمہ داری بھی ان کو سونپی گئی تھی انہوں نے تین عدد کوڑے غصے کے سبب زیادہ لگائے جونہی امام اس قصہ سے آگاہ ہوئے انھوں نے کوڑے کو قنبر سے لیا اور انھیں زمین پر لٹایا پھر تین اضافی کوڑے ان کو لگائے یہ ہے عدل اسلامی کہ حتی وہ شخص جو برسوں امامؑ کی خدمت میں رہا اور اب بھی حد کے اجرا کی ذمہ داری اسے سونپی گئی غلطی پر وہ بھی سزا کا مستحق ہوتا ہے .

منہ بند رکھنے کی قیمت دی جائے

سال ہا سال کے بعد جب حکومت اسکے اہل کو دی گئی اور حضرت علیؑ نے زمام امور کو اپنے ہاتھ میں لیا مسلمانوں کا ایک گروہ جو ابھی تک اسلام کی حقیقت کو نہیں پہچانتا تھا وہ صرف بین الاقوامی سیاستدانوں کی طرح سوچتا کرتا تھا ، امام کی خدمت میں پہنچا انھوں نے کہا آپ کی حکومت نئی ہے اور آپ کو اپنی طاقت کے ستونوں کو مضبوط بنانے کی شدید اور سخت ضرورت ہے ہم یہ مشورہ دیتے ہیں کہ بیت المال سے کچھ رقم روسا ، اور بڑے لوگوں اور حکومت کے چہتیوں کے درمیان تقسیم فرمائیں تا کہ اس طرح امکانی دشواریوں کو روکا جائے یعنی منہ بند رکھنے کا حق انھیں ادا کیا جائے ، امامؑ نے ان خدا سے بے خبر اور علیؑ کی معرفت نہ رکھنے

والے سیاستمداروں کے جواب میں فرمایا " کیا تم مجھ جیسے شخص سے توقع رکھتے ہو کہ میں اپنی عدل کی حکومت کے ستونوں کو ظلم و ستم کے ساتھ مضبوط بناؤں ؛ اور کیا شرک کے پاؤں کے ذریعہ انسان توحید کے مقصد تک پہنچ سکتا ہے؟" اگر میں نے حکومت کو قبول کیا ہے تو اس لیے کہ اس قسم کی نا انصافیوں اور باج ادا کرنے کو ، مسلمانوں کے درمیان سے ختم کردوں اور آپ توقع رکھتے ہیں کہ میں ایسے عمل کا ارتکاب کروں اور اس طرح عدل ختم کرنے کا ذمہ دار قرار پاؤں ؟ ! (وسائل ج ۱۱ / صفحہ ۸۰)

کمالات کی بناپر زیادہ حصہ نہیں لینا چاہیے

امام صادق ؑ نے فرمایا " تمام مسلمان اسلام کے فرزند ہیں اور میں انکے درمیان بیت المال کی تقسیم میں کوئی فرق نہیں سمجھتا ہوں اور معنوی کمالات جیسے اسلام ، علم کا زیادہ ہونا یا تقویٰ و جہاد اسی طرح کے دوسرے کمالات قیامت سے متعلق ہیں نہ یہ کہ بیت المال سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے" (وسائل ج ۱۱ / صفحہ ۸۱) معلوم ہوتا ہے کہ امام ؑ کا یہ بیان بعض توقعات یا فکری روش کے سلسلے میں تھا بعض لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ جن فضائل کے وہ حامل ہیں ان کی وجہ سے وہ خاص توجہ کا باعث قرار پائیں اور بیت المال سے زیادہ حصہ لینے کے حقدار بن جائیں کہ امام صادق ؑ نے مذکورہ بیان کے ذریعہ اس غیرمناسب توقع اور فکری روش کو ختم کردیا . یقیناً اگر بعض کمالات و فضائل اور عمدہ صفات کی وجہ سے ہم زیادہ حصہ دے دیں تو ہم دو خطاؤں کے مرتکب ہونگے .

۱۔ یہ کہ کمالات کی اہمیت کو ہم نے ایک ناچیز قیمت کے ذریعہ خریدا ہے۔

۲۔ اخلاص کو صاحب کمال لوگوں میں ہم نے متزلزل کیا ہے۔ کیونکہ کمالات حاصل کرنے کی راہ میں ہم نے ان کی نظر کو مادی مسائل کی طرف موڑ دیا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ اگر ہم معنوی صفات اور روحی کمالات کی قیمت لگائیں اور ان کو بیت المال سے کم اور زیادہ حصہ ادا کرنے کا باعث سمجھیں تو اس طرح ہم نے راہ کمال طے کرنے والوں پر ایک ناقابل تلافی ضرب لگائی ہے۔

امامؑ کا شدید اعتراض

حضرت علیؑ شخصاً اپنے نمائندوں کے کاموں کو زیر نظر رکھتے تھے اور مخفی و آشکار محاسب ان پر مقرر فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ عوام مکمل آزادی کا حق رکھتے اور نمائندوں کے کمزور پہلوؤں کو امامؑ تک پہنچاتے، ان شکایات میں ایک ایسی شکایت بھی تھی جو فارس میں امام کے نمائندے کے متعلق بھیجی گئی تھی، شکایت یہ تھی کہ یہ نمائندہ اپنے رشتہ داروں اور تمام مسلمانوں کے درمیان فرق رکھتا ہے اور انکو زیادہ حصہ ادا کرتا ہے۔ امامؑ جو مظہر عدالت تھے آپ نے اپنے نمائندے کو آگاہ کیا اور ایک خط میں لکھا، تیرے اور تیرے رشتہ داروں اور دوسرے تمام مسلمانوں کے درمیان ذرہ برابر فرق نہیں ہونا چاہیے (نہج البلاغہ عبدہ جلد ۳ صفحہ ۷۰)

امامؑ کا عمر کو آگاہ کرنا

حضرت علی علیہ السلام نے بعض نصیحتوں میں جو عمر کو کرتے تھے فرمایا "کہ

تم تین بنیادی مسئلوں میں بہت دقت کرو۔

اول ۔ ان حدود میں جو مجرموں اور غلط کام کرنے والوں کے درمیان جاری کرتے ہو لوگوں کے درمیان کسی قسم کے امتیاز کو مدّ نظر نہ رکھو۔

دوسرے ۔خوشی اور غضب ، ہر حال میں خدا کے حکم کے مطابق احکام جاری کرو۔

تیسرے ۔ بیت المال کی تقسیم میں نژاد و ذات پات کی رعایت نہ کر (وسائل الشیعہ جلد ۱۸ / صفحہ ۱۵۶ بنقل از الحیاۃ جلد ۲ / صفحہ ۳۸۷)۔

یعنی خدا کا حکم جاری کرنے کے سلسلے میں روحی حالت (خوشی و غضب) و ذات پات و قبیلے اور دوسرے روابط کو مدنظر نہ رکھو۔

امامؑ نے عدالت کو کیوں ترک کیا

عمر کی حکومت کا دور تھا۔ ایک شخص نے حضرت علیؑ کے خلاف قاضی وقت کے پاس شکایت کی ، دونوں فریق عدالت میں حاضر ہوئے ، قاضی جس کو گفتگو کرنے حتی نگاہ کرنے اور نام لینے میں دونوں فریقوں کے درمیان یکساں عمل کرنا چاہیئے ،اس نے امامؑ اور دوسرے شخص کا نام لینے میں فرق کیا اس نے امامؑ کا نام احترام اور کُنیت کے ساتھ لیا لیکن دوسرے شخص کو صرف اس کے نام کے ساتھ پکارا ۔ امام غصّہ ہو گئے آپ نے کورٹ(عدالت) کو ترک کر دیا اور فرمایا " عادل قاضی کو دو فریقوں کے درمیان فرق نہیں رکھنا چاہیے تم نے ہمارا نام لینے میں فرق

کیا اور مجھے خاص احترام کے ساتھ خطاب کیا یہ اسلامی عدالت نہیں ہے۔ (صوت العدالۃ الاسلامیہ بنقل از داستان راستان)

دوسرا مطلب جو اس واقعہ میں نظر آتا ہے، وہ یہ کہ علیؑ جیسی ہستی کا حاضر ہونا ایک گمنام شخص کے ساتھ ہے اور وہ بھی بغیر اس کے کہ ان کے لیئے ایک خاص عدالت یا ایک خاص وقت یا ایک مخصوص قاضی یا مخصوص جگہ مدّ نظر رکھی جائے، لہذا یہ خود عدالت اسلامی کے اوج و بلندی کا نقطہ ہے۔

عدالت کے نمونہ

بحث و عمل میں ضد

قرآن مجید کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی عادلانہ روش کو تمام موضوعات میں مشاہدہ کرتے ہیں اس کے تمام احکام میں بے طرفی، عدالت اور انصاف بخوبی نظر آتی ہے ہم اس کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ اسلام جب چاہتا ہے کہ شراب کو حرام قرار دے تو پہلے اس کے منافع (وہ اقتصادی منافع جو شراب بنانے کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں یا اس کے طبی منافع) کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر ارشاد فرماتا ہے: "واثمھما اکبر" کہ شراب کا نقصان اس کے فوائد سے بڑھ کر ہے۔

۲۔ قرآنِ مجید اپنے ان تمام امتیازات کے باوجود کہ جو دین اسلام رکھتا ہے

اپنے سے پہلے نازل ہونے والی آسمانی کتابوں کو نظر انداز نہیں کرتا اور ارشاد فرماتا ہے " ومصدقاً لما بین یدیہ " تحریف نہ ہوئی کتابیں توریت اور انجیل جو مجھ سے پہلے نازل ہوئیں ان کی میں تصدیق کرتا ہوں . اور یہ خود انصاف کا ایک دوسرا نمونہ ہے .

۳ ۔ اہل کتاب (یہود و نصاری) کی امانت داری کے سلسلے میں سب کو ایک بیان کے ذریعہ سرزنش نہیں کرتا ہے بلکہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض اس قدر امین ہیں کہ اگر بہت سا مال بھی ان کے نزدیک امانت کے طور پر رکھ دیا جائے تو وہ اس میں خیانت نہیں کرتے اور مال کو صحیح و سالم آپ کو واپس کر دیں گے . لیکن ان میں سے بعض اس قدر ذلیل و پست اور خائن ہیں کہ اگر آپ ایک دینار کو ان کے پاس رکھیں آپ کو وہ بھی واپس نہیں دیں گے (آل عمران / ۷۵) یہ پیغمبرؐ اسلام کے منصفانہ بیان اور حق بات کا نمونہ ہے . ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے حتی ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا، روایات اور اخلاقِ اسلامی میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے . کہ علمی گفتگو میں اگر بحث ، عدالت کے مدار اور حق کی تلاش کے محور سے خارج ہو جائے اور جھگڑے و اپنی بات منوانے کا باعث بن جائے تو فوراً بحث ترک کردیں اگرچہ حقیقت میں حق ہماری طرف ہی کیوں نہ ہو

عدالت کفار اور دشمنوں کی نسبت

عدالت کا اجراء نہ صرف دوست کے متعلق اور طبیعی حالت میں ، بلکہ جنگ کی حالت میں اور دشمن کے متعلق بھی اس کی تاکید کی گئی ہے .

۱۔ " فان قاتلوکم فاقتلوھم . کذلک جزا الکافرین " (بقرہ / ۱۹۱) اگر دشمن تم سے لڑے تم بھی ان سے لڑو . ہاں ؛ کافروں کی جزا یہی ہے . عدالت یہاں پر مارنا ہے اور اس کے علاوہ پشیمانی اور بد حالی کا سبب ہے لیکن کسی بھی صورت میں حملہ آپ کی طرف سے نہ ہو بلکہ اگر انھوں نے حملہ کیا ہے تو آپ اس کا مقابلہ کریں .

۲۔ " ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطاناً فلا یسرف فی القتل " (اسراء / ۳۳) اور جو شخص بے گناہ اور مظلوم مارا جائے گا تو ہم نے اس کے وارث کو برتری اور کچھ اختیارات قرار دیں گے (اگر وہ چاہے قصاص اور انتقام لے اور اگر وہ چاہے تو خون بہاء لے . . .) لیکن مقتول کے اولیاء اور سرپرست اس بات کا حق نہیں رکھتے کہ انتقام لینے اور قتل کرنے میں اسراف اور زیادتی اختیار کریں . یہ آیت جاہلیت کے دور کے ایک خاص تعصب کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر ایک شخص ایک قبیلے سے مارا جاتا تھا تو قبیلے کے تمام لوگ کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک چند آدمیوں کو اس ایک آدمی کے انتقام کے بدلے قتل نہ کردیتے تھے ، اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھتے تھے . لیکن اس غیر مناسب تعصب کے مقابلے میں قرآن ، عدالت کا حکم دیتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے " فلا یسرف فی القتل " قصاص اور انتقام لینے میں اسراف نہ کریں . آپ صرف یہ حق رکھتے ہیں کہ اسی قاتل کو اس کی سزا تک پہنچائیں .

حضرت علیؑ ضربت کھانے کے بعد اپنے دونوں بیٹوں امام حسنؑ اور امام

حسینؑ کو اپنی وصیت میں اپنی ہدایات کے ضمن میں یہ تاکید فرماتے ہیں " لا تقتلنّ بی الاّ قاتلی " میری شہادت کی وجہ سے قتل عام کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا بلکہ اسی میرے قاتل ابن ملجم کو قتل کرنا پھر فرماتے ہیں " فاضربوہ ضربۃً بضربۃٍ " یعنی اس نے مجھے ایک ہی ضرب لگائی ہے، آپ بھی اس کو ایک ہی ضرب لگائیں (نہج البلاغہ صبحی صالح صفحہ ۴۲۲) ہاں حضرت علیؑ اپنے خون میں غلطاں تھے لیکن ہرگز عدالت کے مرکز و محور سے خارج نہ ہوئے۔

۳۔ اسلام کی نوآوری میں سے ایک چیز یہ ہے کہ ایک وسیع علاقہ کو حرم کے نام سے قرار دیا اور جنگ و لڑائی اس علاقے میں بالکل ممنوع قرار دیدی ہے، وہ جگہ ایک آزاد زمین ہے جہاں حیوان کا شکار بھی ممنوع ہے۔ اس کی گھاس کو زمین سے اکھیڑنا جائز نہیں ہے لیکن اس کے باوجود قرآن ارشاد فرماتا ہے " اگر اسی علاقہ میں دشمن آپ پر حملہ کرے تو آپ اپنا دفاع کریں اور اگر وہ قتل کرنے کا اقدام کریں تو تم بھی ان کو قتل کرو، کیونکہ کافروں کی سزا یہی ہے " (بقرہ / ۱۹۱)

۴۔ اگر وہ آپ پر تجاوز کریں تو آپ بھی اسی مقدار میں ان پر تجاوز کا حق رکھتے ہیں " فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ماعتدیٰ علیکم واتقوا اللہ " (بقرہ ۱۹۳)

۵۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان مخالفین کے متعلق جنہوں نے غلط کام کرنے، وقتل وغارت اور خدا کے بندوں کو ان کے گھروں سے نکالنے میں شرکت نہیں کی ان کے ساتھ عدالت سے پیش آئیں " لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین

ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ۔ ان اللہ یحب المقسطین " خداوندعالم ان لوگوں سے انصاف اور نیکی کرنے سے تم کو منع نہیں کرتا ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے لڑائی نہیں کی ہے اور نہ تم کو تمہارے شہر سے نکالا تم کو چاہیے کہ ان بے ضرر مخالفین سے عدالت و انصاف کے ساتھ پیش آؤ کیونکہ خدا وند انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے " (ممتحنہ / ۸)

۶ ۔ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ ہم پڑھتے ہیں " وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم بہ " اگر آپ معاف اور صبر کرنے والے نہیں ہیں اور حتماً بدلہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ویسا ہی بدلہ لیں جیسا کہ ان کی طرف سے آپ پر سختی اور زیادتی کی گئی ہے نہ اس سے سخت تر، بہر حال اگر صبر کریں تو بہتر ہے " ولئن صبرتم لھو خیرالصابرین " (نحل / ۱۲۵)

۷ ۔ سورۂ مائدہ میں ہم پڑھتے ہیں "لایجرمنکم شنان قوم علیٰ الاّ تعدلوا" (مائدہ / ۸) ایک قوم کے ساتھ دشمنی تم کو بے انصافی کی طرف مجبور نہ کردے ۔

۸ ۔ اگرچہ آیات اس سلسلے میں بہت زیادہ ہیں لیکن ہم ایک اور آیت کو یہاں تھوڑی سے وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے اور اس حصّے کو تمام کرینگے ۔

" لاتقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مؤمناً تبتغون عرض الحیوۃ الدنیا " (نساء / ۹۴) یہ آیت ایک ایسے واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی کہ جس کا خلاصہ یہ ہے :

پیغمبر اسلامؐ نے کچھ لوگوں کو خیبر کے یہودیوں کی (پوزیشن واضح) کرنے

کیلئے بھیجا. بہیودیوں میں سے ایک نے اپنے اموال کو ایک پہاڑ کی پناہ میں قرار دیا اور مسلمانوں کے استقبال کیلئے آیا و اسلام کو ظاہر کیا بعض مسلمانوں نے جلدی کی اور کہا اس کا اسلام مکرو فریب اور دھوکا ہے اور وہ اپنی جان کے خوف اور اپنے اموال کی حفاظت کی خاطر ایسا اظہار کرتا ہے. اورآخر کار اس کو قتل کردیا. آیت نازل ہوئی. اس میں ارشاد ہوا کہ " جو شخص اسلام کا اظہار کرتا ہے اس کو نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے اور اس طرح اس کے قتل کرنے کی راہ کو تم اپنے لیے ہموار کرلو اور اس کو ناحق قتل کردو. اس کے اموال کو غنیمت کے طور پر لوٹ لو اور اس قسم کے احمقانہ فیصلوں سے پرہیز کریں. البتہ اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ دشمن کی ہر بات کو جلد قبول کرلے اور اس کے مکر و فریب کے سامنے انسان فوراً سر خم کر دے، کیونکہ اسی آیت کے آخر میں وارد ہوا ہے کہ اس قسم کے موارد میں ضروری ہے کہ آپ تحقیق و تفتیش کریں نہ کہ قتل کرنے میں جلدی سے کام لیں. اور نہ سادگی میں (شریفانہ طور پر) ہر قسم کے اظہار پر اعتماد کریں بلکہ درمیانی راستہ وہی سماجی عدالت کی حفاظت ہے. تحقیق اور جستجو ہے. یہ ہے ہمارا عقیدہ اور یہ ہے ہماری سماجی عدالت. جنگوں کے متعلق اور مخالفین کے متعلق، کہ بے ضرر لوگوں کی نسبت عدالت و محبت سے پیش آئیں اور دشمن و تکلیف پہونچانے والے افراد کے متعلق شدت و سختی سے مقابلہ کریں.

خون بھاء اور قصاص سماجی عدالت کا ضامن ہے " ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب " (بقرہ / ۱۷۹،) لغت میں قصاص کے معنی بعد میں آنے کے ہیں ،

کیونکہ مقتول کے وارث قاتل کے متعلق اسی عمل کو انجام دیتے ہیں اور حقیقت میں اس (قاتل) کے عمل کی پیروی کرتے ہیں . لہذا ان کے عمل کو قصاص کہا جاتا ہے . جاہل عرب کی یہ عادت تھی کہ اگر کوئی انمیں سے مارا جاتا تھا اور وہ یہ ارادہ کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کی تلافی کریں اور یہ طرز فکر اسقدر آگے بڑھ گیا تھا کہ ایک شخص کے قتل ہو جانے کی خاطر وہ لوگ حاضر تھے قاتل کے تمام خاندان والوں کو نابود کر دیں . مذکورہ آیت نازل ہوئی اور اس نے قصاص کے منصفانہ و عادلانہ حکم کو بیان کیا.

اسلامی قصاص کا قانون بہت منصفانہ ہے کیونکہ نہ صرف یہودیوں کی طرح قصاص پر تکیہ کرتا ہے اور نہ موجودہ عیسائیوں کی طرح عفو و درگذر اور دیت (خون بھاء) کے راستے کو اپنے ماننے والوں کیلئے اعلان کرتا ہے ، کیونکہ کبھی قصاص پر سختی بعض مفاسد پیدا ہونے کا باعث ہو جاتی ہے اور اس کا حتمی ہونا عقل سے بعید ہے مثلاً قاتل اور مقتول اگر آپس میں بھائی یا رشتہ دار ہوں اور اس صورت میں قصاص لینے پر سختی کرنا خاندان والوں کیلئے مزید غم و اندوہ کا سبب بن جاتا ہے اور دوسری طرف در گذر کرنا یا دیت پر اکتفا کرنا قاتل اور دوسرے ظالموں کو (قتل پر) جری بنانا ہے لہذا اسلام نے اصل حکم قصاص کو قرار دیا لیکن اس کے ساتھ عفو اور خون بھاء کو بھی قرار دیا اور مقتول کے وارثوں کو اختیار دیا کہ قصاص ، دیت یا عفو میں سے جو چاہیں اختیار کریں.

قرآن کریم میں منصفانہ قصاص

"وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس والعین بالعین وا لانف بالانف والاذن بالاذن والسن بالسن والجروح قصاص فمن تصدق بہ فھو کفارۃ لہ"

بعض تفاسیر میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں یہودیوں کے دو مشہور قبیلے بنام "بنی النضیر" اور "بنی قریظہ" مدینے میں زندگی بسر کرتے تھے بنی نضیر طاقتور تھے۔ اگر ان میں سے کوئی بنی قریظہ کے کسی شخص کا قتل ہوتا تو اس کے بارے میں قصاص اجرا نہیں ہوتا تھا لیکن اگر کبھی کوئی بنی قریظہ کا فرد ان کے کسی فرد کا قاتل ہوتا تو اس کو فوراً پھانسی دے دیتے تھے۔ اسلام جب آیا تو اس نے اس امتیاز کا خاتمہ کردیا، بنی نضیر جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا انھوں نے پیغمبرؐ اکرم سے چاہا کہ وہ اسی جاہلیت اور طاقت کی روش پر باقی رہیں اور قصاص کا حق اسی طرح یک طرف اور ان کے نفع میں برقرار رہے، پیغمبر اکرمؐ نے ان کی اس بات کو قبول نہیں کیا اور فرمایا" قصاص میں عدالت صرف اسلام سے مخصوص نہیں ہے بلکہ توریت میں بھی اس کا بیان آیا ہے" (تفسیر نمونہ، از قرطبی، ذیل آیہ ۴۴ سورۂ مائدہ)

اگر کوئی شخص عمداً کسی بے گناہ کو قتل کرے مقتول کے وارث قاتل کو پھانسی کی سزا دلا سکتے ہیں "وکتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس"

اگر کوئی شخص دوسرے کی آنکھ کو زخمی کرے اور اس کو ختم کردے دوسرا شخص بھی پہلے والے کی آنکھ کو ختم کرسکتا ہے "والعین بالعین" ناک کاٹنے کے

بدلے میں جائز ہے ناک ہی کاٹی جائے " والانف بالانف " کان کاٹنے کے بدلے میں کا کان ہی کاٹنا جائز ہے " والاذن بالاذن " اگر کسی کے دانت توڑے گئے ہیں تو وہ بھی جانی کے دانت توڑسکتا ہے " والسن بالسن ".

خلاصہ یہ کہ جو شخص کسی دوسرے کو زخمی کرے تو اس کا ویسا ہی بدلہ لیا جا سکتا ہے " والجروح قصاص " لہذا قصاص کا حکم منصفانہ طور پر اور بغیر کسی رنگ و نسل و سماجی طبقہ بندی کے فرق کے ساتھ اجراء ہونا چاہئے.

عبادت میں میانہ روی

ضروری ہے کہ اس موضوع کی جانب بھی ہم توجہ کریں کہ جس کے بارے میں ہماری روایات میں بہت تاکید ہوئی ہے اگر کبھی روحانی اعتبار سے بعض غیر واجب (مستحب) عبادتوں کیلئے آپ آمادہ نہیں ہیں ان کو اپنے اوپر نہ لادیں اور بوجھ نہ بنائیں ، اور آپ کوشش کریں کہ عبادت کو نشاط و فرحت اور دل کی آمادگی کے ساتھ انجام دیں امام صادقؑ نے فرمایا ہے " لا تکرھوا الی انفسکم العبادہ " (کافی جلد ۲ صفحہ ۷۸) عبادت کو اپنے اوپر نہ لادیں اور دوسری حدیث میں ہم پڑھتے ہیں " لا تکرھوا عبادۃ اللہ الی عباد اللہ " اور عبادت خدا کو اُس کے بندوں پر نہ لادو اور بالخصوص بچوں کی تربیت کے سلسلے میں سفارش ہوئی ہے کہ ان کو زیادہ آزادی دیں اور وہ عبادت جو واجب نہیں ہے ان پر سختی کے ساتھ بار نہ کریں اور اس سلسلے میں بھی حدیث موجود ہے.

تعریف و اعتراض میں میانہ روی اور عدالت

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ اعتدال و میانہ روی اور عدالت کی مراعات ہر مسلمان کی زندگی میں ہونی چاہیے۔ وہ مسائل جن پر دقیق توجہ رکھنی چاہیے وہ یہ کہ غیر مناسب تعریف اور وہ بے جا اعتراضات کہ جن کا معاشرے اور سماج پر بُرا اثر پڑتا ہے ان سے اجتناب کرنا چاہیے حضرت علیؑ فرماتے ہیں " الثناء باکثر من الاستحقاق ملق و التقصیر عن الاستحقاق عی او حد " (حکمت ۳۳۹ / از نہج البلاغہ فیض الاسلام صفحہ ۱۲۲۹) اگر آپ کسی کی تعریف اس کی لیاقت سے زیادہ کریں تو آپ تملق پرست اور چاپلوس ہیں اور جو شخص مدح و تعریف کا مستحق ہے اس کی کم تعریف کریں تو آپ عاجز ہیں یا حاسد، کہ آپ کی روح دوسروں کی تعریف برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتی، لہٰذا دوسروں کی مدح و تعریف میں ہمیں عدالت و انصاف کو مدنظر رکھنا چاہیے ورنہ دونوں عیوب میں سے کسی ایک میں ہم مبتلا ہو جائیں گے۔

عدالت محبت اور اعتراض کے بارے میں

اعتراض کرنے میں بھی عدالت کو (مدّنظر) رکھنا چاہیے، حضرت علیؑ نے فرمایا " الافراط فی الملامة یشبّ نیران اللجاجة " (تحف العقول بہ نقل از کودک) سرزنش کرنے میں افراط اس بات کا باعث بن جاتی ہے کہ طرف مقابل میں ضد و ہٹ دھرمی کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اس میں انفجار (پھٹنے) کی کیفیت پیدا ہو جاتی

ہے۔ اور ماں، باپ کو ان مسائل میں خاص طور پر وقت سے کام لینا چاہیے کہ حد سے زیادہ محبت بچے کے سست ہونے کا سبب بن جاتی ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ "آخری زمانے کے والدین پر افسوس کہ بچوں کی نسبت ان کی حد سے زیادہ محبت، ان کی خود خواہی کا سبب بن جاتی ہے۔" اور دوسری طرف بچے کو محبت کی کمی کا احساس نہ ہونے پائے، کیونکہ حدیث میں ہم پڑھتے ہیں "من کان لہ صبیٌ صبا" جو شخص فرزند رکھتا ہے اس کو بھی بچے کی طرح ہونا چاہیے۔ محبت کرنے میں، بات چیت کرنے میں اور کھیلنے کودنے میں ان کے ساتھ ان کا ہم قدم ہونا چاہیے اور اس طرح ان کی روحانی و باطنی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہیے۔

اخراجات میں میانہ روی

اگر چہ ہماری گفتگو اس حصے میں، سماجی عدالت سے متعلق ہے لیکن بعض دوسری مفید یاد دہانیاں قرآن مجید اور روایات سے استفادہ کیلئے نقل کرتے ہیں جو ہمارے مسئلے سے متعلق ہیں۔ ان مسائل میں ایک مسئلہ زندگی کے اخراجات کی عدالت کا ہے اسلام نے اس سلسلے میں بھی دوسرے موارد کی طرح درمیانی راستے کو اختیار کیا اور نیک لوگوں کی تعریف میں یوں ارشاد فرمایا ہے "والذین اذا انفقوا لم یسرفوا و لم یقتروا و کان بین ذالک قواما" (فرقان/۶۷) وہ لوگ جو خرچ میں اسراف کے مرتکب نہیں ہوتے ہیں اور بخل و کنجوسی سے پرہیز کرتے ہیں، اور وہ خرچ میں درمیانی راستہ اختیار کرتے ہیں۔

خداوند سورۂ بنی اسرائیل (اسراء) میں اپنے پیغمبرؐ سے اسطرح خطاب فرماتا

ہے " لا تجعل یدک مغلولة الی عنقک و لاتبسطها کل البسط " (اسراء/ ۲۹) خرچ کرنے میں تم اپنے ہاتھ کو گردن سے نہ باندھ لو. (بخل اور کنجوسی کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ جو ہاتھ گردن سے بندھا ہے وہ جیب کی طرف نہیں جاتا ہے) اور دوسری طرف یہ حکم ہے کہ جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے اس کو خرچ مت کرو، کیونکہ ممکن ہے چند روز کے بعد تو حاجتمند ہو جائے، زندگی میں درمیانی راستہ " الاقتصاد فی المعیشہ " کے عنوان کے تحت ہمارے ہاں بہت زیاد روایات موجود ہیں.

گھر کی چار دیواری میں عدالت

" وان خفتم الا تعدلوا فواحدة " (نساء/ ۳) اگر اس بات سے ڈرتے ہو کہ اپنی بیویوں کے درمیان عدالت قائم نہ رکھ سکو گے، تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو.

پیغمبر گرامی اسلامؐ حتی اپنی عمر کے آخری دور میں جب کہ بیمار تھے اپنی بیویوں کے درمیان عدالت کی مراعات کرتے تھے اور ان کی بیماری کی حالت میں ان کے بستر کو ہر رات ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جو جس بیوی سے مربوط ہوتا، منتقل کرتے تھے (نظام حقوق زن) پیغمبر اکرمؐ کی بیوی عائشہ کہتی ہیں " پیغمبر اکرمؐ کسی ایک بیوی کو دوسری پر ترجیح نہ دیتے تھے اور سب کے ساتھ مساوی برتاؤ رکھتے تھے. ہر روز سب کے پاس جاتے اور ان کی مزاج پُرسی کرتے تھے لیکن ہر ایک کے کمرے میں سونا نوبت سے تھا. اگر نوبت کو بدلنا چاہتے تھے تو

، اس نوبت والی بیوی سے اجازت لے لیتے تھے" پھر عائشہ کہتی ہیں "میں نے خود اپنی نوبت کسی دوسری کو نہ دی" (نظام حقوق زن) حضرت علیؑ کی جس زمانے میں دو بیویاں تھیں حتیٰ اگر وضو کرنا چاہتے تھے تو اس عورت کے گھر میں وضو نہیں کرتے تھے جس کی ہاں نوبت نہ ہوتی تھی۔

ہاں عدالت کو خون کی طرح معاشرے کی تمام رگوں اور سبھی پہلوؤں میں جاری ہونا چاہیے۔

اقتصاد میں عدالت

اسلام کا اقتصادی نظام بھی عدالت کی بنیاد پر قائم ہے، یعنی ایسا نظام بنایا گیا ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو اور ہر صاحب حق اپنے کام یا ضرورت کے مطابق دینی زندگی کو آسانی کے ساتھ گذار سکے۔

کام کی مقدار

اسلام میں اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ اپنی یومیہ اوقات کو کچھ موضوعات کیلئے تقسیم کر دیں۔ کچھ گھنٹوں کو کام کیلئے بعض کو عبادت اور بعض کو تفریح و حلال لذت کیلئے مخصوص کردیں تاکہ اس طریقے سے اپنی تمام معنوی اور مادی ضروریات پوری ہوجائیں (نہج البلاغہ فیض الاسلام صفحہ ۱۲۰۷) اگر بعض لوگوں کے کام کی مقدار اس حد تک پہنچ جائے جو کام کاج کے میدان کو دوسروں پر تنگ کر دے تو، ولی فقیہ اور حاکم اسلامی اس کو کنٹرول کرسکتے ہیں مثلاً اگر بعض لوگ بہت

ساری بنجر زمین کو آباد کریں اس قانون کے مطابق کہ " من احیا ارضاً مواتاً فھی لہٗ" جو شخص بنجر زمین کو آباد کرے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے وہ اس کے مالک ہو جائنگے. لیکن اگر یہ ان کا آباد کرنا دوسرے لوگوں کے محروم ہونے کا باعث بن جائے اور تعادل بر قرار نہ رہے توحکومت اسلامی اور ولایت فقیہ ان کے آباد کرنے کو منصفانہ طور پر محدود کرسکتے ہیں: اسلام نےکام کی نوعیت میں بھی غلط وباطل و تخریبی و فریبی کاموں کو ممنوع قراردیاہے۔

تقسیم کرنے میں عدالت

حضرت علیؑ فرماتے ہیں، " ان للاقصی مثل الذی للادنی " (نہج البلاغہ صبحی صالح / نامہ بہ مالک اشتر صفحہ ۴۳۸) ملک کے دور دراز علاقے میں وہی چیز تقسیم ہونا چاہیے جو ملک کے نزدیک ترین حصے میں تقسیم ہوتی ہے. حکومت کا سرمایہ یکساں طور پر سب لوگوں کیلئے خرچ ہونا چاہیے اور ایسا نہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ حکومت کے مرکز سے نزدیک تر ہیں وہ زیادہ حصے سے فائدہ اٹھائیں ،بعض انبیاء جیسے حضرت شعیبؑ کا توحید اور نبوت کے بعد سب سے پہلا پیغام تقسیم کرنے میں عدالت کے متعلق تھا اور کم فروخت کرنے والوں کو ان کا پیغام آگاہ کرنے کے طور پر تھا، "اوفو الکیل ولا تکونوا من المخسرین وزنوا بالقسطاس المستقیم و لاتبخسوالناس اشیائھم و لاتعثوا فی الارض مفسدین" (شعراء/ ۱۸۰ _ ۱۸۳) لوگوں کا حق ادا کرنے میں پیمانے کو برابر رکھا کریں اور اس سے کچھ کم نہ کریں اور صحیح اور درست ترازو کے ساتھ وزن کیا کریں اور جو مقدار ادا کرنا چاہیں اس میں سے کسی چیز کو کم نہ

کریں اور کم ناپ و تول کے ذریعہ زمین میں فساد برپا نہ کریں۔ ہم سورۂ مطففین میں پڑھتے ہیں "ویل للمطففین" کم بیچنے والوں پر وای ہو کیونکہ ان کے دینے اور لینے میں باہم فرق ہے لینے کے وقت پورا لیتے ہیں اور دینے کے وقت کم دیتے ہیں۔

فائدہ اٹھانے اور خرچ کرنے میں عدالت

خرچ کرنے کی مقدار میں بھی عدالت کو مدنظر رکھنا چاہیے قرآن واضح طور پر کچھ آیات میں اس طرح ارشاد فرماتا ہے " کلوا من ثمرہ اذا اثمر و آتوا حقه یوم حصادہ " (انعام/ ۱۴۱) جوں ہی درخت پھل لائیں آپ بھی ان سے استفادہ کریں اور میوے توڑنے کے دن ہی محرومین کے حصے کو بھی ادا کردیں، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے" کلوا واشربوا و لاتسرفوا "کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو (اعراف/ ۳۱) " کلوا من طیبات ما رزقناکم ولاتطغوا فیه" پاک و پاکیزہ اور دلپسند غذائیں جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں ان سے استفادہ کرو اور اپنے خرچ و فائدہ اٹھانے میں سرکشی اور تجاوز و بغاوت کا راستہ اختیار نہ کرو (طہ/ ۸۱) حضرت علیؑ متقی و پرہیزگار لوگوں کی علامات اور صفات کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں " وملبسهم الاقتصاد " (اصول کافی/ جلد ۲) وہ سادہ لباس سے استفادہ کرتے ہیں۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں " لو اقتصد الناس فی المطعم لا ستقامت ابدانهم " (النظام التربوی فی الاسلام صفحہ ۳۷۹ بہ نقل از فصول المهمة) اگر لوگ غذا کے مصرف میں میانہ روی اختیار کریں تو ان کا بدن پائیدار اور سالم باقی رہے گا۔ مقدار مصرف بیان کرنے کے علاوہ قرآن نے اس کی حالت پر بھی زور دیا ہے اور فرماتا ہے کہ "آپ کے

مصرف کرنے کی غذا حلال بھی ہونی چاہیے اور پاک اور دلپسند بھی ہونی چاہیے " (انفال / ۶۹) اور اس کے مہیا کرنے میں تقویٰ کو بھی مدّ نظر رکھنا چاہیے۔

پیغمبرؐ و ائمہؑ اور فقہاء، عدالت کے محافظ ہیں

عدالت کے قائم کرنے کیلئے انبیاءؑ کے حکم کو دیکھیں:

کیونکہ زندگی میں لوگوں کے منافع کے درمیان تضاد اور اختلاف ہے اور مجبوراً لڑائی اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، طرفین میں سے ہر ایک خود کو صاحب حق سمجھتا ہے اور یا حاضر نہیں ہے جو بات اسنے کہی ہے اس سے پیچھے ہٹ جائے، یہاں پر عدالت قائم کرنے کیلئے اسلام نے لوگوں کو انبیاءؑ کی طرف رجوع کرنے کو کہا ہے اور فرمایا ہے " فان تنازعتم فی شی فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر " (نساء/ ۵۹) اگر تم کسی بات کے بارے میں آپس میں لڑ پڑو تو خدا اور پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو، آپ کا رجوع کرنا خدا و قیامت پر آپ کے سچے ایمان کی نشانی ہے، اور اس حدیث پر توجہ رکھتے ہوئے کہ جس میں ارشاد ہوتا ہے " العلماء ورثۃ الانبیاءؑ " (ولایت فقیہ۔ امام خمینیؒ) جھگڑے کے مواقع پر جہاں عدالت کی حد سے انحراف کا خطرہ اور دوسروں کے حقوق پامال ہونے کا خوف در پیش ہو، وہاں عادل علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیے تا کہ وہ خدا کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں۔

مسلمان نماؤں کی پہچان

جو شخص تنازعات میں علماء اور ذی صلاح لوگوں کی طرف رجوع نہ کرے اور جھگڑے کو ظالم و طاغوتی عدالتوں میں فیصلے کیلئے لے جائے اور ظالموں سے فیصلے اور عدالت کی امید رکھے ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان پر نظر ثانی کرے کیونکہ وہ خیال کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے " الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت و قد امروا ان یکفروا بہ " (نساء / ۶۰) کیا ان لوگوں کو تم نے نہیں دیکھا ہے جو خیال کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور خدا کے فرامین جو تم پر اور تم سے پہلے پیغمبروں ؑ پر نازل ہوئے ان پر ایمان رکھتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ طاغوت کی طرف جھکاؤ پیدا کرتے ہیں . اور اپنے جھگڑوں کو تمہارے پاس نہیں لاتے ہیں . لوگوں کا یہ گروہ خیال کرتا ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ ہرگز مسلمان نہیں ہیں کیونکہ ہم نے ان کو حکم دیا کہ طاغوت اور ظالم کے پاس نہ جائیں اور انکا انکار کریں لیکن انھوں نے ہماری بات کو قبول نہیں کیا.

فقیہ ، سماجی عدالت پر حفاظت کا ذمہ دار ہے

خداوند عالم نے ہم کو پیدا کیا اور ہماری ابدی سعادت کے نظم کو پیغمبر اسلام ؐ کے ذریعہ ہم پر واضح اور روشن کیا پیغمبر ؐ معاشرے کے رہبر و پیشوا اور لوگوں کے حقوق کے محافظ اور ان کی ہدایت کے ذمہ دار ہیں، پیغمبر ؐ کے بعد ائمہ ؑ

کی نوبت آتی ہے کہ جو ہدایت کی ذمہ داری کو اپنے دوش پر لیتے ہیں اور امامؑ کی غیبت کے زمانے میں وہ ذمہ داری اسلام کی معرفت رکھنے والوں اور فقہاء کے دوش پر عائد ہوتی ہے کہ جو مکمل عدالت و لیاقت و سیاسی بینش اور مدیریت کے علاوہ حکم خدا کو قرآن کی آیات اور ائمہؑ کی احادیث کے درمیان سے نکال سکیں اور انھیں اس میدان میں کافی قدرت و تبحر کا مالک اور ماہر ہونا چاہیے تاکہ ان کو فقیہ کہا جاسکے۔ وہ پیغام جو حضرت مہدی علیہ اسلام سے نقل ہوا ہے اس میں تمام لوگوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ "واما الحوادث الواقعة فارجعوا فیها الی رواة احادیثنا" (کتاب اکمال الدین بہ نقل از ولایت فقیہ امام خمینیؒ) وہ حوادث جو پیش آتے ہیں ان میں جلد بازی اور خودغرضی سے کام نہ لیں اور حتماً ان عادل فقہاء کی طرف ان میں رجوع کریں جن کے اندر تم ہوا و ہوس نہ پاتے ہوں، تاکہ وہ خدا کے راستے اور اس کے حکم کو اس سلسلے میں تمہارے لیے بیان کریں۔

ولی فقیہ، سماجی عدالت کا مضبوط سہارا ہے

امام رضاؑ نے فرمایا " لو لم یجعل لهم اماماً قیما ؛ حافظاً ، مستودعاً ، لدرست الملة " (علل الشرایع جلد ۱ / صفحہ ۱۵۲ بہ نقل از حکومت اسلامی امام خمینیؒ) اگر خداوند لوگوں کے لیے امام اور پیشوا قرار نہ دیتا جو ان کے امور کی زمام کو اپنے ہاتھ میں لیتا اور منصفانہ، عادلانہ نگرانی رکھتا تو نظام درہم و برہم ہو جاتا۔ دوسری حدیث میں ہم پڑھتے ہیں " الفقهاء امناء الرسل " (کتاب ولایت فقیہ امام خمینیؒ) فقہاء انبیاءؑ کے امین ہیں۔ اور ایک منصفانہ نظام کو قائم کرنے کیلئے ان کی طرف رجوع کرنا

چاہیے۔

"ابوخدیجہ" جو امام صادقؑ کے معتمد ساتھیوں میں سے ہیں، امامؑ کی طرف سے وہ مامور ہوتے ہیں کہ لوگوں میں اعلان کریں کہ اپنے جھگڑوں میں عدالت اور حکم خدا کو قائم کرنے کیلئے صرف عادل فقہاء کی طرف رجوع کریں

" اجعلوا بینکم رجلاً قد عرف حلالنا و حرامنا فانی قد جعلته قاضیاً "

(ولایت فقیہ امام خمینی) صرف ایسے شخص کی طرف رجوع کریں جو ہمارے حلال و حرام سے خوب آگاہ ہو پس اس قسم کے لوگوں کو تمہارے لیے باعنوان قاضی منصوب کرتا ہوں۔

کبھی معاشرے میں ایسے مسائل پیش آتے ہیں کہ ان کا صریح حکم قرآن یا حدیث میں نہیں ملتا ہے لیکن اس کے قواعد، اصول، معیار، اوراستنباط کے تمام راستے فقیہ کے ہاتھ میں ہیں جو ان کے ذریعہ اس مسئلے کے حکم کو پیدا کرتا ہے۔

اگر کبھی معاشرہ اپنے امنیتی، اقتصادی یا سیاسی اعتدال کو ہاتھ سے گنوا دے تو وہ فقیہ کہ جو حقِ ولایت اور نظارت معاشرے پر رکھتا ہے وقتی طور پر اعتدال کو بر قرار رکھنے کیلئے ضروری احکامات صادر کرسکتا ہے کچھ معاملات کو حرام کر سکتا ہے عوام الناس کو دفاع کا حکم دے سکتا ہے، وقتی طور پر مالیات میں اضافہ کرسکتا ہے، بعض کمپنیوں کو بند کر سکتا ہے۔

میرزای شیرازی نے جونہی دیکھا کہ ملک کی اقتصادی صورتحال تنباکو کے ذریعہ انگریزوں کے ہاتھ لگ گئی ہے، تو انھوں نے تنباکو نوشی کی حرمت کا فتویٰ دیکر

اس ظالم و ستمگر حکومت پر راستہ بند کردیا۔ امام خمینیؒ نے حکومت شنشاہی کی چھاؤنیوں سے فوجیوں کے بھاگنے کا حکم صادر کیا اور سابق شاہ کو تخت حکومت سے معزول کر دیا۔ حضرت علیؑ نے گھوڑوں کیلئے بھی زکوۃ اسلامی اور ٹیکس مقرر فرما یا اور جونہی ان سے سوال ہوا کہ پیغمبرؐ نے گھوڑوں کیلئے کیوں زکوۃ مقرر نہیں فرمائی تو آپ نے فرمایا " میں مؤمنین پر ولایت رکھتا ہوں اور اس سال جو استثنائی صورت حال سامنے آئی ہے اپنے حق ولایت سے استفادہ کرسکتا ہوں اور بیت المال کیلئے مزید سرمایہ مہیا کرنے کیلئے گھوڑوں کی زکوۃ کو مقرر کرسکتا ہوں۔ (وسائل الشیعہ)

خاتمہ

ایک حقوقی داستان یا ایک فقہی قاعدہ

دیگر بہت سی آزادیوں کے ساتھ جو اسلام نے انسان کو عطا مقرر کی ہیں، ایک گھر کی آزادی ہے کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ گھر کے مالک کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہو جائے " لا تدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتیٰ تستانسوا " (نور، ۲۷) گھر کے مالک کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخل نہ ہوں لیکن ایک ضدی اور سرکش مرد بنام " سمرہ " کبھی کبھی بغیر اجازت کے پیغمبر اسلامؐ کے صحابی کے باغ میں جاتا اور اس کی بیوی اور بچوں کو چھپ کر دیکھتا تھا، اس کا بہانہ اس

غلط عمل کیلئے یہ تھا کہ میرا اس باغ کے ایک کونے میں ایک درخت ہے. اور اس کو دیکھنے کیلئے میں باغ میں آتا جاتا ہوں. پیغمبر اکرمؐ کے صحابی نے اس سے کہا، درخت دیکھنے کیلئے کوئی مانع نہیں ہے، لیکن باغ میں آنے سے پہلے میرے بیوی بچوں کو آگاہ کر دیا کرو تا کہ وہ پردہ کرلیں. سمرہ نے کہا کوئی ضروری نہیں ہے. باغ کے مالک نے یہ شکایت پیغمبر اکرمؐ کے پاس کی. آنحضورؐ نے اس کو بلایا اور نصحت فرمائی. اس نے نصحیت کو قبول نہ کیا پیغمبرؐ نے فرمایا کہ "اس درخت کو ایک دوسرے درخت سے جو دوسری جگہ ہے بدل لو". اس پر قبول نہیں کیا. رسول اکرمؐ نے فرمایا "تو اپنے درخت کو اسے بیچ دے". پھر بھی وہ شخص راضی نہ ہوا. پھر حضورؐ نے فرمایا کہ "کم از کم اس کی اجازت سے باغ میں جاؤ اس نے قبول نہ کیا. پیغمبرؐ نے فرمایا "اس درخت کو چھوڑ دو، اس کے بدلے میں تمہارے لیے بہشت میں ایک درخت کی ضمانت لیتا ہوں". پھر بھی اس نے صد کی. پیغمبرؐ سمجھ گئے کہ اس کا مقصد نقصان پہنچانا اور ہٹ دھری ہے پھر پیغمبرؐ نے باغ کے مالک کو حکم دیا کہ اس کے درخت کو کاٹ دو. (وسائل الشیعہ جلد ۱۷، صفحہ ۳۴۰)

"لاضرر ولاضرار فی السلام"

عدالت سے انحراف کے عوامل

معمولاً تین اہم عامل عدالت سے انحراف کیلئے پائے جاتے ہیں اور کہ قرآن مجید نے تینوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

انحراف کا پہلا عامل؛ حب ذات، تعلقات اور روابط ہیں. قرآن اس بارے

میں فرماتا ہے "یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ و لو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین ان یکن غنیاً او فقیراً فاللہ اولیٰ بھما" (نساء/ ۱۳۵) اے ایمان لانے والو مکمل طور پر عدالت کو قائم کرو اور تمہاری گواہیاں صرف خدا کیلئے ہوں، اگر چہ سچی گواہی تمہارے لئے یا تمہارے والدین اور تمہارے رشتہ داروں کے ضرر میں تمام ہو. اور فقیر یا غنی ہونے کا مسئلہ تمہاری گواہی دینے پر اثرانداز نہ ہو، کیونکہ خدا زیادہ سزاوار ہے اس بات پر کہ وہ ان کی حمایت کرے. یعنی آپ کی ذمہ داری صرف حق سے دفاع کرنا ہے اور کسی بھی رشتے یا اقتصادی لحاظ کو اس میں مدّ نظر نہ رکھیں.

یہ آیت خطرناک تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خبردار، تمہاری دوستیاں اور جذباتی رشتے یا خاندانی مسائل تم کو عدالت کی حد سے دور کردیں.

دوسرا عامل اس بارے میں کہ انسان عدالت کی راہ پر حرکت نہ کرے. بعض پریشانیوں کا ہے جو انسان کسی فرد یا کسی گروہ کی طرف سے برداشت کرتا ہے اور اس سلسلے میں قرآن ارشاد فرماتا ہے " یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط و لایجرمنکم شنان قومٍ علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ" (مائدہ/ ۸) اے ایمان لانے والو تمہاری عدالت کی روش اخلاص اور منصفانہ گواہی پر مبنی ہو، کسی قوم کی سخت دشمنی عدالت کی حد سے تمہارے انحراف کا سبب نہ بن جائے. اور گذشتہ حسابات کو پورا ادا نہ کرپائیں، دوبارہ حکم فرماتا ہے کہ عدالت سے پیش آو جو تقویٰ و پرہیز گاری سے نزدیکتر ہے. اس آیت میں ایک

خاص توجہ ان شکایات ، ناراضگی اور عدالت کے مسئلہ کی طرف ہے جو بظاہر ہماری روش اور قضاوت و فیصلے پر اثرانداز ہوتی ہے .

تیسرا عامل جو انسان کو عدالت کے مرکز و محور سے خارج کرتا ہے ، وہ رشوت کا مسئلہ ہے ، قرآن اس سلسلے میں اس طرح آگاہ فرماتا ہے " ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل و تدلوا بها الیٰ الحکام لتاکلوا فریقاً من اموال الناس بالاثم و انتم تعلمون " (بقرہ / ۱۸۸) ایک دوسرے کے اموال کو آپس میں غلط و ناجائز طریقے سے نہ کھاو ، گناہ کے طور پر لوگوں کے اموال کا ایک حصہ کھانے کیلئے اس کا کچھ حصہ حکام و قضات کے پاس نہ لیجاو ، بالفرض قاضی تمہارے حق میں حکم صادر کردے تو تم جانتے ہو کہ یہ فیصلہ رشوت کی بنیاد پر ہوا ہے اور رشوت کے مال میں تصرف حرام ہے . قاضی کا ظاہری حکم اس شخص کے بارے میں جو اپنے کو غلط سمجھتا ہے ، مالک ہونے کا سبب نہیں بنتا . امام صادقؑ نے فرمایا " وامّا الرشا فی الحکم فهو الکفر بالله العظیم " (وسائل جلد ۲) البتہ فیصلہ کرنے میں رشوت لینا خداوند عظیم پر کفر باندھنا ہے ایک مشہور حدیث جو رسول اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے اس میں ہم یوں پڑھتے ہیں " لعن الله الراشی و المرتشی و الساعی بینهما " خداوند رشوت لینے اور رشوت دینے اور جو دونوں کے درمیان واسطہ بنے ، لعنت کرے اور ان کو اپنی رحمت سے دور رکھے . واضح رہے کہ کبھی اس غلط عمل کو فریب دینے والے ناموں ، مانند " ھبہ ، تعارف ، حق و حساب ، حق الزحمہ ، مزدوری اور انعام کے ذریعہ " چھپایا جاتا ہے . پیغمبر اسلامؐ کو خبر دی گئی کہ آپ

کے ایک فرماندار نے رشوت کو ہدیہ کی شکل میں قبول کیا ہے. حضرتؑ غصہ ہوئے اور اس سے فرمایا جو چیز تیرا حق نہیں ہے اس کو تو کیوں لیتا ہے؟ اس نے کہا جو کچھ میں نے لیا ہے وہ ہدیہ ہے نہ کہ رشوت! پیغمبرؐ نے فرمایا "ارایت لو قعد احدکم فی دارہ ولم تولہ عملاً أکان الناس یھدونہ شیئا؟" "اگر تم گھر میں بیٹھ جاؤ اور میری طرف سے کسی محل کے فرماندار بھی نہ ہو تو کیا اس صورت میں بھی لوگ تم کو ہدیہ دیں گے؟ اسلام نے ہدایت کی ہے کہ قاضی ذاتاً و شخصاً بازار نہ جائے کہ ممکن ہے قیمتوں کی کمی نادانستہ طور پر اس پر اثر انداز ہو جائے اور فیصلہ و قضاوت کرتے وقت، قیمت میں تخفیف کرنے والے کی طرفداری کرے.

وہ آیت جس نے پیغمبرؐ کو بوڑھا بنا دیا

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا "سورۂ ہود میں ایک آیت ایسی ہے جس نے مجھے بوڑھا اور ضیعف بنا دیا ہے اور وہ یہ ہے "استقم کما امرت" اس طرح استقامت رکھو جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے" اس آیت میں غور کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اصل استقامت و صبر کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ قرآن میں دوسری آیات بھی موجود ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کو صبر و استقامت کا حکم دیتی ہیں، اس آیت کی خصوصیت جملہ "کما امرت" ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ کبھی استقامت تعصب و ضد کی بنیاد پر ہے نہ کہ خدا کے حکم کی بنیاد پر، اور کبھی استقامت و حوصلہ کی بنیاد لوگوں کی گفتگو پر مبنی ہے کہ یہ نہ کہیں کہ فلاں شخص ڈر گیا یا تھک کر چھوڑ گیا، کبھی استقامت اضطرار کی بنیاد پر ہے اور کبھی قدرت ظاہر کرنے

کی بنیاد پر ہے . اور تمام صورتوں میں استقامت جو ہے وہ خدا کی نظر میں بے قیمت ہے .کیونکہ یہ چیز مدار حقیقت سے کافی دور ہے اور مسئلہ کا الٰہی پہلو ہونا بھی اس میں نہیں ہے . لہٰذا قرآن میں ہم پڑھتے ہیں "والذین صبروا ابتغاء وجہ ربھم" (رعد/ ۲۲) وہ لوگ جن کا صبر و حوصلہ و استقامت صرف رضاء خدا کیلئے ہے ، نہ انتقام لینے کیلئے اور نہ شہرت حاصل کرنے کیلئے اور نہ کسی طعنہ کے خوف سے بلکہ ان کی استقامت و پائیداری صرف خدا کیلئے ہے .

مختصر یہ کہ عدالت پر عمل کرنا اور الٰہی معیاروں کے مطابق اس پر چلنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ اولیاء خدا اس پر عمل کرنے میں خدا سے مدد طلب کرتے ہیں . اور ممکن ہے اس صراط سے مراد جو قیامت میں بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر ہے ، اور حتمی طور پر ہم سب اس پر سے گزریں گے وہ دنیا میں یہی الٰہی خط (روش) و مسیر ہو جو حقیقت میں بال سے باریک تر ہے .

سماجی عدالت کا قیام ایک عام نگرانی سے وابستہ ہے

ایک وقت سبھی گاڑیاں دائیں طرف سے چلتی ہیں تا کہ تمام ڈرائیور ایک دوسرے کی حرکات پر نظر رکھ سکیں اور جونہی وہ یہ دیکھیں کہ ایک ڈرائیور خلاف ورزی کررہا ہے سب ہارن بجائیں سب لائٹیں جلا کر غلطی کرنے والے کو آگاہ کریں ، اور ان سب کے باوجود پولیس طاقت کے ساتھ اس کام میں مداخلت کرکے اس پر جرمانہ کرے . اور اگر پولیس بے خبر ہے تو لوگ اس کی خلاف ورزی سے پولیس کو آگاہ کریں گے .

اس قسم کے محیط میں بہت کم ڈرائیور اپنے کو خلاف ورزی کرنے کی اجازت دیتے ہیں یہ مذکورہ مثال ایک نمونہ تھا اب اگر ہم چاہیں کہ سب لوگ تمام مسائل میں عدالت اور قانون کی حد سے باہر نہ جائیں تو ہمیں "امر بالمعروف" (نیکی کی ہدایت کرنا) اور " نہی عن المنکر " (برائی سے روکنا) کے دو قوانین سے استفادہ کرنا چاہیئے اور ہم کسی بھی خلاف ورزی کے مقابلے میں خاموش اور بے توجہ نہ رہیں اور ہر شخص جس طریقے سے بھی وہ یہ کام انجام دے سکتا ہو اپنا ردعمل ظاہر کرے اور اس روش کی خلاف ورزی کرنے والے پر ہم قافیہ حیات تنگ کردیں گے اور اس کو صحیح سمت کی طرف چلنے کی ہدایت کریں گے.

اس دن کی امید میں جس دن ہمارا ثقافتی انقلاب ظفر مندانہ انداز میں دنیا کی تمام یونیورسٹیوں تک پہنچ جائے گا. یہ وہ دن ہے جب فارغ التحصیل ڈاکٹر اگر بیماری کو پہچان نہ پائے تو صدق دل سے اعلان کریگا کہ میں بیماری کو نہیں سمجھ سکا ہوں اور اخلاص کے ساتھ پیسہ واپس کردیگا. اور برادرانہ انداز میں بیمار کو کسی متخصص و ماہر ڈاکٹر کی طرف راہنمائی کریگا اور یہ وہ دن ہے کہ معاشرے میں سماجی عدالت و انصاف کے بہت سے نمونے دیکھنے کو ملیں گے.

Acc No. 13076 Date 15/4/11
... 9-2091 ... Status ...
D.D. Class ...
NAJAFI BOOK LIBRARY

ہماری کتب

۱۔ دُعائے کمیل ——— ترجمہ: سید رضی جعفر صاحب قبلہ

۲۔ اہلبیت حلالِ مشکلات ——— ڈاکٹر تیجانی سماوی

۳۔ طبِ اسلامی اور جدید میڈیکل سائنس کے انکشافات ——— ڈاکٹر جواد

۴ سچی کہانیاں ۔ اوّل ——— مرتضیٰ مطہری

۵ سچی کہانیاں ۔ دوم ——— 〃 〃

۶۔ مجموعہ قصائد ——— سیدہ لطیف النساء

۷۔ بیاض تسکین صدائے زہرا۔ مرتبہ: محمد حسین نگر بھکری ایم اے

۸ چودہ معجزے ——— 〃 〃 〃

۹۔ دو معجزے ——— 〃 〃 〃

۱۰۔ مجموعہ مناجات، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام 〃

۱۱۔ مجموعہ مناجات (کامل) حضرت عباس علمدار علیہ السلام 〃

۱۲۔ امامت عدل اور سماجی انصاف ——— محسن قرائتی

دیگر قرآن و سیرت، تاریخ حدیث و فقہ اور دعا و مناجات کی کتب

ملنے کا پتہ: **الحسن بک ڈپو**

مسجد باب العلم، نارتھ ناظم آباد۔ کراچی فون: [illegible]

Rs 70/-